ابتدا تیرے نام سے

قارئین کرام! ایک بار پھر آنکھیں لہو رو رہی ہیں اور دل ہے کہ پھٹا جاتا ہے۔ اس بار اہلِ لاہور پر قیامت گزر گئی۔ تیس معصوم بچوں سمیت بہتّر بے گناہ دہشت گردی کی بھینٹ چڑھ گئے۔ پارک میں کھیلنے اور کھانے پینے کے لیے آئے ہوئے ہنستے مسکراتے چہرے ہمیشہ کی نیند سو گئے۔ دشمن کے آلہِ کار بن کر گمراہ ہونے والے لوگ اپنے ہی ہم وطنوں کی خوشیاں چھین رہے ہیں۔ پاک فوج کی کوششوں سے حالات میں خاصی بہتری آئی تھی اور امید بندھ چلی تھی کہ اب اے پی ایس اور چارسدہ جیسا کوئی واقعہ نہیں ہوگا۔ مگر ان دیکھے دشمن نے ایک بار پھر گلشنِ اقبال پارک میں قوم کے نونہالوں کو خون میں نہلا دیا۔

اس سانحے کے بعد حسب معمول عزائم دہرائے جا رہے ہیں اور اعلیٰ سطح کے اجلاس ہو رہے ہیں۔ مگر آئندہ کے لیے کوئی بھی پالیسی بناتے ہوئے ضروری ہے کہ دہشت گردی کے خلاف کامیاب ہوتی ہوئی اس جنگ کو اتنا بڑا دھچکا لگنے کی وجوہات کا حقیقت پسندانہ تجزیہ کیا جائے۔ اس سلسلے میں سب سے زیادہ اہمیت کی حامل خبر بلوچستان سے پکڑے جانے والے را کے ایجنٹ بھوشن یادیو کی ہے۔ پاکستان میں دہشت گردی کے واقعات میں پہلے بھی کئی بار را کا ہاتھ ثابت ہو چکا ہے۔ حکومت کو چاہئے کہ بھارت کا اصل دہشت گرد چہرہ دنیا کو دکھائے اور اس معاملے میں کسی کمزوری کا مظاہرہ نہ کیا جائے۔ اب اتنے واضح ثبوت کے بعد بھی اگر اصل دشمن پر سختی سے ہاتھ نہیں ڈالا جائے گا تو یہ قومی مفادات کے صریحاً خلاف ہوگا۔ ہمارے لوگ دشمن کے ہاتھوں گمراہ ہوتے رہیں گے۔ اگر حکومت اور سکیورٹی ایجنسیاں اس معاملے میں یکسو اور ہم آہنگ نہیں ہوں گی تو دہشت گردی سے نجات ایک خواب ہی رہے گا۔

اس کے علاوہ گزشتہ ماہ چند ایسے اقدامات ہوئے جن کے نتیجے میں ملک میں انتہا پسندی کو فروغ ملنے کے امکانات بڑھ گئے۔ اس نازک وقت میں ہمیں ایسی پالیسیوں سے اجتناب کرنا چاہیے جن سے قوم تقسیم ہوتی ہے اور ایک کثیر طبقہ عدم تحفظ کا شکار ہوتا ہے۔ ملکی صورتحال کو دیکھتے ہوئے ممتاز قادری کو پھانسی دینا، جبکہ سنگین مقدمات کے مجرم سالہا سال سے جیلوں میں بند ہیں، ہرگز ایک دانشمندانہ اقدام قرار نہیں دیا جا سکتا، جبکہ دوسری طرف اسی دن شرمین عبید کی دستاویزی فلم کو آسکر ملنے کا اعلان ہوا تھا اور اس سے قبل اس فلم کی وزیراعظم ہاؤس میں نمائش کے ذریعے اس کو حکومتی سطح پر پروموٹ بھی کر دیا گیا۔ اس نمائش سے یہ تاثر ملا کہ حکومت مسائل کا حل کرنے کی بجائے دنیا کے سامنے ان کا تماشا لگانے میں زیادہ دلچسپی رکھتی ہے۔ دیکھا جائے تو پاکستان میں عورتوں سے بدسلوکی کی صورتحال حکومت ہی کی بدنامی اور ناکامی ہے، اس میں قابلِ فخر بات کیا تھی۔ تیسری طرف پنجاب میں تحفظ خواتین کے نام سے جو بل پاس کروایا گیا اس کے بارے میں ایک چینل نے خاصی عبرت ناک وڈیو دکھائی کہ خود حکومت کی خواتین ارکان اسمبلی کو اس بل کی الف بے بھی معلوم نہیں تھی۔ بل میں چند ایسی شقیں ڈالی گئیں جن سے مسئلہ حل کرنے سے زیادہ مغرب کی تقلید اور اپنی اقدار سے لاتعلقی نظر آتی ہے۔ ان تمام اقدامات سے غالب تاثر یہ بنا کہ امریکہ کی خوشنودی کے لیے، جلد بازی کے ساتھ اور حکمت کے بغیر، ایک لبرل ایجنڈے کو فروغ دینا اور پاکستان کو اس کے آئین کے مطابق ایک اسلامی فلاحی مملکت کی بجائے سیکولر ریاست بنانا مقصود ہے۔ یہ تاثر اس وقت کسی طرح بھی ملکی امن و امان کے لیے فائدہ مند نہیں ہے۔

اس وقت اخلاص کا تقاضا یہ ہے کہ تمام ذاتی مفادات اور بیرونی دباؤ سے قطع نظر ایک ایک قدم اپنے قومی مفاد کو سامنے رکھ کر اٹھایا جائے، عوام کو تقسیم کرنے والے اقدامات نہ کیے جائیں بلکہ قوم کو متحد اور دہشت گردی کے خلاف یکسو کیا جائے۔

خواتین پر گھریلو تشدد کے خلاف کوئی بھی اقدام قابل ستائش ہے لیکن بہت بہتر ہوتا اگر اس بل پر دیگر جمہوری قوتوں خصوصاً دینی طبقات کے تحفظات دور کر لیے جاتے۔ اس معاملے میں دینی احکامات اور سنتِ رسول ﷺ وصحابہ کرام اتنی واضح ہے کہ اسلامی تعلیمات سے آگاہی رکھنے والا کوئی شخص بھی عادتاً عورتوں پر ہاتھ اٹھانے یا ان پر ذہنی ونفسیاتی تشدد روا رکھنے کی حمایت نہیں کر سکتا۔ ضرورت صرف یہ تھی کہ یہ بل پورے خلوصِ نیت کے ساتھ اور وسیع پیمانے پر مشوروں کے بعد تیار کیا جاتا۔

سابق صدر جنرل مشرف کو ملک سے فرار ہونے کی اجازت دے دینا ہر محبّ وطن پاکستانی کے لیے تکلیف دہ بات ہے۔ ایک ایسا فوجی آمر، جس پر ملک وقوم سے غداری کے سنگین ترین مقدمات قائم تھے، اس کو ایک جمہوری حکومت نے اعزاز کے ساتھ حکومت سے رخصت کیا تو دوسری جمہوری حکومت نے جان بخشی کر کے ملک سے رخصت کر دیا۔ اس اقدام سے ایک بار پھر وہ ساری امیدیں دم توڑ گئی ہیں کہ ہمارے ہاں کسی قومی سطح کے مجرم کو کبھی سزا ملے گی۔ یہ روایت اور مستحکم ہوگئی ہے کہ ملکی سطح کے مجرم ایک دوسرے کے جرائم کا تذکرہ کر کے اپنی سیاست تو چمکاتے ہیں مگر اختیار ملنے پر ایک دوسرے کو تحفظ دیتے اور احسانات کا بدلہ چکاتے ہیں تاکہ بقائے باہمی کی فضا قائم رہے۔

ایک ڈرامہ کراچی میں بھی نمائش پر ہے۔ متحدہ قومی موومنٹ کا ملک دشمن اور مجرمانہ کردار بے نقاب ہونے پر اب سب لوگ اس ڈوبتی کشتی سے چھلانگیں لگا رہے ہیں۔ قانون کی گرفت سے بچنے اور اپنے سیاسی مستقبل کو بچانے کے لیے یہ ایک نیا حربہ ہے۔ لیکن کیا مشرف جیسے بڑے مجرم کو چھوڑ دینے کے بعد یہ امید باقی ہے کہ پاکستانی قوم، خصوصاً اہلِ کراچی کے ان مجرموں کو بلا رعایت انصاف کے کٹہرے میں لایا جائے گا؟

فروری کے مہینے میں دامنِ اردو دو اہم شخصیات سے محروم ہوگیا۔ دونوں شخصیات ایسی ہیں کہ جن کی خدمات کو نہ صرف قومی بلکہ بین الاقوامی سطح پر مختلف اعزازت کے ذریعے سراہا گیا۔ انتظار حسین اردو افسانے کی آن بان تھے۔ ناول نگار، کالم نگار اور شاعر بھی تھے۔ انسانی نفسیات اور معاشرے کی حرکیات پر گہری نظر رکھنے والے ادیب تھے۔ فاطمہ ثریا بجیا نے اپنے ناولوں اور ڈراموں میں برصغیر کے مسلمانوں کی اعلیٰ ثقافت کو زندہ رکھا۔ اللہ دونوں کو غریقِ رحمت کرے۔ اردو زبان کو ذریعہ اظہار بنانے اور اس کو وسعت دینے والے اٹھتے جا رہے ہیں، جبکہ سرکاری سطح پر اردو کی ترویج وترقی کو مسلسل نظر انداز کیا جا رہا ہے۔ نئے انداز کے لٹریری فیسٹیول اردو کی بجائے انگریزی کو فروغ دینے کا پروگرام رکھتے ہیں۔ اردو کو دفتری اور سرکاری زبان بنانے کا حکم بھی ابھی تک سنجیدگی سے عمل درآمد کا منتظر ہے۔ یہ فکر انگیز صورتحال ہے۔ نئی نسل میں اردو زبان میں ایسے اعلیٰ پائے کے ادیب اور شاعر پیدا کرنے کے لیے ضروری ہے کہ اردو کو اس کا صحیح مقام نصیب ہو۔

اگلے ماہ تک اجازت، بشرطِ زندگی!

دعا گو

صائمہ اسما

قرآن کے مطابق زندگی

قرآن کی پیروی

اگر آپ پہلے ہی لمحے سے اس خدا کے آگے کامل سپردگی میں اپنے اندر تبدیلی لانا اور اپنی زندگی کی تعمیرِ نو کرنا شروع کر دیں جس نے آپ کو قرآن دیا ہے تو قرآن پڑھنے سے آپ کو بہت تھوڑا فائدہ ہوگا، آپ کے حصے میں نقصان اور پریشانی بھی آسکتی ہے۔ اگر عمل کے لئے قوتِ ارادی اور کوشش نہ ہو تو قلب کی کیفیات، روح کے وجد آفرینی اور علم میں اضافے سے آپ کو کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ اگر قرآن آپ کے اعمال پر کوئی اثر نہ ڈالے اور آپ اس کے احکامات کی اطاعت نہ کریں اور جو وہ منع کرتا ہے، اس سے نہ رکیں تو پھر سمجھ لیجئے آپ قرآن کے قریب نہیں ہو رہے۔

قرآن کے ہر صفحے پر سرِ تسلیم خم کرنے، اطاعت کرنے، عمل کرنے اور تبدیلی لانے کی دعوت ہے۔ جو اس کے حکم تسلیم نہ کریں، انہیں کافر، ظالم اور فاسق کہا گیا ہے (المائدہ ۴۷)۔ جن لوگوں کو اللہ کی کتاب دی گئی ہے لیکن وہ نہ اس کو سمجھتے ہیں نہ اس پر عمل کرتے ہیں انہیں ایسے گدھے قرار دیا گیا جو بوجھ لادے ہوئے ہیں مگر جو کچھ لادے ہوئے ہیں، نہ اس کو جانتے ہیں نہ اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ (الجمعہ ۶۲:۵)

یہ وہ لوگ ہیں جن کے خلاف اللہ کے رسولؐ قیامت کے روز فریاد کریں گے: اے میرے رب، میری قوم نے اس قرآن کو پس انداز کردہ چیز بنالیا تھا (الفرقان ۲۵:۳۰)۔

قرآن کو ترک کر دینا، ایک طرف رکھ دینا اس کا مطلب ہے اس کو نہ پڑھنا، نہ سمجھنا، نہ اس کے مطابق زندگی گزارنا۔ اس کو ایک قصہ پارینہ سمجھنا جس کا اب کوئی کام نہیں رہا ہے۔ رسول اللہؐ نے قرآن کی پیروی پر زور دینے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ آپؐ نے فرمایا:

میری امت کے بہت سے منافق قرآن پڑھنے والوں میں سے ہوں گے۔ (احمد) وہ شخص قرآن کا سچا ماننے والا نہیں ہے جو اس کے حرام کیے ہوئے کو حلال سمجھتا ہے۔ (ترمذی)

قرآن کی تلاوت کرتا کہ تم جو کچھ وہ منع کرتا ہے، اس سے رک سکو۔ اگر یہ تمہیں اس قابل نہ بنائے کہ تم رک جاؤ تو تم نے اس کی حقیقی معنوں میں تلاوت نہیں کی ہے۔ (طبرانی) صحابہ کرامؓ کے لئے قرآن سیکھنے کا مطلب، اس کو پڑھنا، اس پر غور و فکر کرنا اور اس پر عمل کرنا ہوتا تھا۔ روایت ہے کہ

جو لوگ قرآن پڑھنے میں مشغول تھے، بتاتے ہیں کہ عثمان ابن عفانؓ اور عبداللہ بن مسعودؓ جیسے لوگ جب ایک دفعہ رسولؐ سے دس آیات سیکھ لیتے تھے تو جب تک ان آیات میں علم اور عمل کے حوالے سے جو کچھ ہوتا تھا، اسے واقعی نہیں سیکھ لیتے تھے، آگے نہیں بڑھتے تھے۔ وہ کہا کرتے تھے کہ انہوں نے قرآن اور علم ایک ساتھ سیکھا ہے۔ اس طرح بعض وقت وہ صرف ایک سورت سیکھنے میں کئی برس صرف کرتے تھے (سیوطی: **الاتقان فی علوم القرآن**)۔

حسن بصریؒ کہتے ہیں: ''تم نے رات کو اُونٹ سمجھ لیا ہے جس پر تم قرآن کے مختلف مراحل سے گزرنے کے لئے سواری کرتے ہو۔ تم سے پہلے والے لوگ اسے اپنے مالک کے پیغامات سمجھتے تھے۔ رات کو اس پر غور و فکر کرتے تھے اور دن اس کے مطابق گزارتے تھے۔''

(احیاء العلوم)

قرآن کے مطالعے سے آپ کے دل میں ایمان پیدا ہونا چاہئے۔ اس ایمان کے مطابق آپ کی زندگی کو ڈھلنا چاہئے۔ یہ کوئی تدریجی مرحلہ وار عمل نہیں ہے جس میں آپ پہلے کئی برس قرآن پڑھنے

میں، پھر اسے سمجھنے میں، پھر ایمان مضبوط کرنے میں صرف کریں۔ اور پھر اس کے بعد اس پر عمل کریں۔ جب آپ کلام الٰہی سنتے ہیں یا تلاوت کرتے ہیں تو آپ کے اندر ایمان کی چنگاری روشن ہو جاتی ہے۔ جب اندر ایمان داخل ہو جاتا ہے، تو آپ کی زندگی بدلنی شروع ہو جاتی ہے۔ جو بات آپ کو یاد رکھنی چاہئے۔ وہ یہ ہے کہ قرآن کے مطابق زندگی گزارنے کا سب سے زیادہ بنیادی تقاضا یہ ہے کہ آپ ایک بڑا فیصلہ کریں۔ دوسرے جو کچھ بھی کر رہے ہوں، معاشرے کے مطالبات کچھ بھی ہوں، آپ کے آس پاس کوئی بھی افکار غالب ہوں، آپ کو اپنی زندگی کا راستہ مکمل طور پر تبدیل کرنا ہوتا ہے۔ یہ فیصلہ عظیم قربانیاں چاہتا ہے۔ لیکن اگر آپ قرآن کو خدا کا کلام تسلیم کر کے اس پر ایمان لا کر چھلانگ لگانے کو تیار نہ ہوں تو آپ جو وقت قرآن کے ساتھ صرف کر رہے ہیں، اس کا کوئی اچھا نتیجہ سامنے نہیں آئے گا۔

پہلے قدم پر، پہلے ہی لمحے یہ بالکل واضح کر دیا گیا ہے کہ قرآن صرف ان لوگوں کے لئے ہدایت ہے جو خدا کی مرضی کے خلاف زندگی گزارنے کے نقصانات، اور اس کی ناراضی مول لینے سے بچنے کے لئے عمل کرنے کو تیار ہیں اور جو نتائج رکھتے ہیں، یہی متقی ہیں۔ (البقرۃ ۲:۱۔۵)

قرآن علم اور عمل کے درمیان اور ایمان اور عمل صالح کے درمیان کوئی دوری اور فاصلہ تسلیم نہیں کرتا۔

قرآنی مشن کی تکمیل

قرآن کے مطابق زندگی گزارنے کا ایک ضروری اور اہم حصہ یہ ہے کہ اپنے اردگرد کے لوگوں تک اس کا پیغام پہنچائیں۔ اللہ کے رسولؐ پر جیسے ہی پہلی وحی نازل ہوئی آپؐ نے اسے عوام تک پہنچانے کے عظیم کام کا احساس کر لیا۔ دوسری وحی **قُمْ فَاَنْذِرْ** کا حکم لیے ہوئے آئی۔ پھر متعدد مقامات پر رسولؐ پر یہ واضح کیا گیا کہ قرآن کو پہنچانا، اسے سنانا اور اس کی تشریح کرنا، آپؐ کا اولین فریضہ اور آپؐ کی زندگی کا مشن ہے۔ (الانعام ۶:۱۹، الفرقان ۲۵:۱، الانعام ۶:۱۰۵، المائدہ ۵:۶۷، مریم ۱۹:۹۷، الاعراف ۷:۱۵۷)

اب آپؐ کے پیروکار ہونے اور اللہ کی کتاب کے حامل ہونے کی حیثیت سے یہی مشن ہمارے سپرد ہے۔ ہمارے پاس قرآن ہونے کا تقاضا ہے کہ ہم اسے اپنے اور دوسروں تک پہنچائیں۔ قرآن سننے کا مطلب ہے کہ اسے سنائیں۔ ہمیں اسے پوری انسانیت پر واضح کرنا چاہئے اور بتانا چاہیے اور چھپا کر نہیں رکھنا چاہئے۔

ان اہل کتاب کو وہ عہد بھی یاد دلاؤ جو اللہ نے ان سے لیا تھا کہ تمہیں کتاب کی تعلیمات کو لوگوں میں پھیلانا ہوگا، انہیں پوشیدہ رکھنا نہیں ہوگا۔ مگر انہوں نے کتاب کو پس پشت ڈال دیا اور تھوڑی قیمت پر اسے بیچ ڈالا۔ کتنا برا کاروبار ہے جو یہ کر رہے ہیں۔ (آل عمران ۳:۱۸۷) اگر آپ کے قلب میں اور ہاتھ میں کوئی چراغ ہے تو اس کی روشنی پھیلنی چاہیے۔ اگر آپ کے اندر کوئی آگ لگی ہے تو اس کی تپش پھیلنی چاہئے۔ جو عارضی دنیاوی مقاصد کے لیے ایسا نہیں کرتے وہ درحقیقت اپنے پیٹ آگ سے بھر رہے ہیں۔

حق یہ ہے کہ جو لوگ ان احکام کو چھپاتے ہیں جو اللہ نے اپنی کتاب میں نازل کیے ہیں اور تھوڑے سے دنیاوی فائدوں پر انہیں بھینٹ چڑھاتے ہیں وہ دراصل اپنا پیٹ آگ سے بھر رہے ہیں۔ قیامت کے روز اللہ ہرگز ان سے بات نہ کرے گا، نہ انہیں پاکیزہ ٹھہرائے گا۔ وہ اللہ کی لعنت کے مستحق ہوں گے۔

جو لوگ ہماری نازل کی ہوئی روشن تعلیمات کو چھپاتے ہیں دراں حالے کہ ہم انہیں سب انسانوں کی رہنمائی کے لئے اپنی کتاب میں بیان کر چکے ہیں، یقین جانو کہ اللہ بھی ان پر لعنت کرتا ہے اور تمام لعنت کرنے والے بھی ان پر لعنت بھیجتے ہیں۔ (البقرہ ۲:۱۶۹) البتہ جو اس روش سے باز آجائیں اور اپنے طرز عمل کی اصلاح کر لیں اور جو کچھ چھپاتے تھے، اسے بیان کرنے لگیں، ان کو میں معاف کر دوں گا (البقرہ ۲:۱۶۰)۔

لیکن اگر وہ اسی حالت میں مر گئے تو ان پر سب کے سب لعنت کریں گے۔

جن لوگوں نے کفر کا رویہ اختیار کیا اور کفر کی حالت میں ہی جان دی ان پر اللہ، فرشتوں اور سب انسانوں کی لعنت ہے (البقرہ ۲:۱۶۱)۔

اللہ ان کی طرف نظر نہیں ڈالے گا:

رہے وہ لوگ جو اللہ کے عہد اور اپنی قسموں کو تھوڑی قیمت پر بیچ ڈالتے ہیں تو ان کے لئے آخرت میں کوئی حصہ نہیں ہے۔ اللہ قیامت کے روز ان سے بات کرے گا نہ ان کی طرف دیکھے گا اور نہ انہیں پاک کرے گا (آل عمران ۳:۷۷)۔

اب، اپنے آپ پر نظر ڈالیے، آج کل کے مسلمانوں کو دیکھئے۔ اس حقیقت کے باوجود کہ دن رات لاکھوں افراد قرآن کی تلاوت کرتے ہیں، اس سے ہمارے حالات میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ یا تو اسے ہم پڑھتے ہیں اور سمجھتے نہیں ہیں، یا اگر سمجھتے ہیں تو اسے تسلیم نہیں کرتے یا اس پر عمل نہیں کرتے، یا اگر ہم اس پر عمل کرتے ہیں تو ہم اس کا ایک حصہ تسلیم کرتے ہیں اور ایک مسترد کرتے ہیں، یا جس وقت ہم اسے پڑھنے میں اور اس کے کسی ایک حصہ پر عمل کرنے میں مصروف ہیں تو ہم اسے چھپانے کا اور اس کی روشنی دنیا تک نہ پہنچانے کے بدترین جرم کا ارتکاب کر رہے ہیں۔

ان میں بعض ان پڑھ ہیں جو کتاب الٰہی کو صرف اپنی آرزوؤں کا مجموعہ خیال کرتے ہیں اور محض وہم و گمان پر چلے جا رہے ہیں۔ پس ہلاکت اور تباہی ہے ان لوگوں کے لئے جو اپنے ہاتھوں سے شریعت تصنیف کرتے ہیں۔ پھر لوگوں سے کہتے ہیں کہ یہ اللہ کے پاس سے آیا ہے تاکہ اس کے ذریعے سے تھوڑی سی قیمت حاصل کرلیں (البقرہ ۲:۷۸-۷۹)۔ تو کیا تم کتاب کے ایک حصے پر ایمان لاتے ہو اور دوسرے حصے کے ساتھ کفر کرتے ہو۔ پھر تم میں سے جو لوگ ایسا کریں ان کی سزا اس کے سوا کیا ہے کہ دنیا کی زندگی میں ذلیل و خوار ہو کر رہیں اور آخرت میں شدید ترین عذاب کی طرف پھیر دیئے جائیں (البقرہ ۲:۸۵)۔

ہمارے ذہنوں میں ذرہ برابر شبہ نہیں ہونا چاہئے کہ جب تک ہم قرآن کے گواہ ہونے کی سب سے اہم ذمہ داری ادا نہیں کریں گے، جو ہم پر اس کا حامل ہونے اور اسے پڑھنے کی وجہ سے آئی ہے، ہم قرآن کا حق ہرگز ادا نہیں کر سکتے۔ بے عزتی، ذلت و تحقیر اور پس ماندگی جو ہمارے حصے میں آئی ہے صرف اس رویے کی وجہ سے آئی ہے جو ہم قرآن کے ساتھ اور جو مشن اس نے ہمارے سپرد کیا ہے اس کے ساتھ رکھے ہوئے ہیں۔

اللہ تعالیٰ اس قرآن سے بعض قوموں کو زوال عطا کرتا ہے اور بعض کو عروج۔ کاش انہوں نے تورات اور انجیل اور ان دوسری کتابوں کو قائم کیا ہوتا جو ان کے رب کی طرف سے ان کے پاس بھیجی گئی تھیں۔ ایسا کرتے تو ان کے لئے اوپر سے رزق برستا اور نیچے سے ابلتا (المائدہ ۵:۶۶)۔

ہم قرآن کے بارے میں کتنا ہی اعلیٰ علمی معیار حاصل کرلیں، ہم قرآن کے مکمل اور حقیقی معانی سمجھنے اور دریافت کرنے میں اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتے جب تک ہم قرآن کی اطاعت نہ کریں۔

رسولؐ نے اپنے صحابہؓ سے فرمایا: ''تم لوگوں میں ایسے لوگ ہوں گے کہ جب تم اپنی نمازوں کا ان کی نمازوں سے، اپنے روزوں کا ان کے روزوں سے، اپنے اچھے اعمال کا ان کے اچھے اعمال سے مقابلہ کرو تو تمہیں اپنے اعمال بہت کم تر محسوس ہوں گے۔ وہ قرآن پڑھتے ہوں گے لیکن یہ ان کے حلق سے نیچے نہیں اترے گا (بخاری)۔

تسلیم و اطاعت قرآن کے حقیقی مشن کی تکمیل کے لئے ہی نہیں، اس کا مفہوم سمجھنے کی بھی یقینی کلید ہے۔ پیروی کرنے سے ایسے معانی سامنے آتے ہیں جنہیں آپ محض غور و فکر سے ہرگز نہیں پا سکتے۔ پھر آپ قرآن کا مشاہدہ کرنے لگتے ہیں۔ سید مودودیؒ کے یادگار الفاظ میں جو بھلائے نہیں جا سکتے:

لیکن فہم قرآن کی ان ساری تدبیروں کے باوجود آدمی قرآن کی روح سے پوری طرح آشنا نہیں ہونے پاتا جب تک کہ عملاً وہ کام نہ کرے جس کے لئے قرآن آیا ہے۔ یہ محض نظریات اور خیالات کی کتاب نہیں ہے کہ آپ آرام سے کرسی پر بیٹھ کر اسے پڑھیں اور اس کی ساری باتیں سمجھ جائیں۔ یہ دنیا کے عام تصورِ مذہب کے مطابق ایک نری مذہبی کتاب بھی نہیں ہے کہ مدرسے اور خانقاہ میں اس کے سارے رموز حل کر لئے جائیں..... یہ ایک دعوت اور تحریک کی کتاب ہے۔ اس

نے آتے ہی ایک خاموش طبع اور نیک نہاد انسان کو گوشۂ عزلت سے نکال کر خدا سے پھری ہوئی دنیا کے مقابلے میں لا کھڑا کیا۔ باطل کے خلاف اس سے آواز اُٹھوائی اور وقت کے علمبرداران کفر و فسق و ضلالت سے اس کو لڑا دیا۔ گھر گھر سے ایک ایک سعید روح اور پاکیزہ نفس کو کھینچ کھینچ کر لائی اور داعیٔ حق کے جھنڈے تلے ان سب کو اکٹھا کیا۔ گوشے گوشے سے ایک ایک فتنہ جو اور فساد پرور کو بھڑکا کر اٹھایا اور حامیانِ حق سے ان کی جنگ کرائی۔ ایک فردِ واحد کی پکار سے اپنا کام شروع کر کے خلافِ الٰہیہ کے قیام تک پورے 23 سال یہی کتاب اس عظیم الشان تحریک کی رہنمائی کرتی رہی، اور حق و باطل کی اس طویل و جاں گسل کشمکش کے دوران میں ایک ایک منزل اور ایک ایک مرحلے پر اسی نے تخریب کے ڈھنگ اور تعمیر کے نقشے بنائے۔

اب بھلا کیسے ممکن ہے کہ آپ سرے سے نزاعِ کفر و دین اور معرکۂ اسلام و جاہلیت کے میدان میں قدم ہی نہ رکھیں اور اس کشمکش کی کسی منزل سے گزرنے کا آپ کو اتفاق ہی نہ ہوا ہو اور پھر محض قرآن کے الفاظ پڑھ پڑھ کر اس کی ساری حقیقتیں آپ کے سامنے بے نقاب ہو جائیں۔ اسے تو پوری طرح آپ اُسی وقت سمجھ سکتے ہیں جب اسے لے کر اٹھیں اور دعوت الی اللہ کا کام شروع کریں اور جس جس طرح یہ کتاب ہدایت دیتی جائے اس طرح قدم اٹھاتے چلے جائیں۔ تب وہ سارے تجربات آپ کو پیش آئیں گے جو نزول قرآن کے وقت پیش آئے تھے۔ مکہ اور حبش اور طائف کی منزلیں بھی آپ دیکھیں گے اور بدر واحد سے لے کر حنین اور تبوک تک کے مراحل بھی آپ کے سامنے آئیں گے۔ ابوجہل اور ابولہب سے بھی آپ کو واسطہ پڑے گا، منافقین اور یہود بھی آپ کو ملیں گے، اور سابقین اولین سے لے مولفۃ القلوب تک سبھی طرح کے انسانی نمونے آپ دیکھ بھی لیں گے اور برت بھی لیں گے۔ یہ ایک اور ہی قسم کا ''سلوک'' ہے، جس کو میں ''سلوکِ قرآنی'' کہتا ہوں۔ اس سلوک کی شان یہ ہے کہ اس کی جس جس منزل سے آپ گزرتے جائیں گے، قرآن کی کچھ آیتیں اور سورتیں خود سامنے آ کر آپ کو بتاتی چلی جائیں گی کہ وہ اسی منزل میں اتری تھیں اور یہ ہدایت لے کر آئی تھیں۔ اس وقت یہ تو ممکن ہے کہ لغت اور نحو اور معانی اور بیان کے کچھ نکال سالک کی نگاہ سے چھپے رہ جائیں، لیکن یہ ممکن نہیں ہے کہ قرآن اپنی روح کو اس کے سامنے بے نقاب کرنے سے بخل برت جائے۔

پھر اسی کلیہ کے مطابق قرآن کے احکام، اس کی اخلاقی تعلیمات، اس کی معاشی اور تمدنی ہدایات اور زندگی کے مختلف پہلوؤں کے بارے میں اس کے بتائے ہوئے اصول و قوانین آدمی کی سمجھ میں اس وقت تک آ ہی نہیں سکتے جب تک کہ وہ عملاً ان کو برت کر نہ دیکھے نہ وہ فرد اس کتاب کو سمجھ سکتا ہے جس نے اپنی انفرادی زندگی کو اس کی پیروی سے آزاد کر رکھا ہو اور نہ وہ قوم اس سے آشنا ہو سکتی ہے جس کے سارے ہی اجتماعی ادارے اس کی بنائی ہوئی روش کے خلاف چل رہے ہوں (تفہیم القرآن، جلد اول، ص ۳۳: ۳۵)

☆.....☆.....☆

زکوٰۃ وخیرات کے مسائل

صحابہ کرامؓ رسول اللہؐ سے مختلف موقعوں پر اپنے مسائل کے بارے میں سوالات پوچھتے تھے اور آپؐ ان کا جواب مرحمت فرماتے تھے۔ یہ سوال و جواب حدیث کی کتابوں میں درج ہیں۔ آپؐ کے جوابات کی حیثیت ایک طرح سے فتاویٰ جات کی ہے۔ امام ابن القیم الجوزی نے ان فتاویٰ کو سوال و جواب کی صورت میں مختلف موضوعات کے تحت مرتب کیا ہے۔ ذیل میں زکوٰۃ وخیرات کے موضوع پر آپؐ کے ارشادات درج کئے جارہے ہیں۔

زیورات پر زکوٰۃ

سوال: حضرت ام سلمہؓ پوچھتی ہیں کہ میرے پاس سونے کے کنگن ہیں تو کیا یہ اس خزانے میں داخل ہیں جن پر جہنم کی وعید ہے؟

جواب: آپؐ فرماتے ہیں:

''جو چیز زکوٰۃ کے نصاب کو پہنچ جائے پھر اس کی زکوٰۃ نکال دی جائے وہ خزانے میں داخل نہیں۔''

سوال: ایک عورت آپؐ سے دریافت کرتی ہے کہ یارسول اللہؐ میرے پاس کچھ زیور ہے، میرا خاوند بھی مسکین آدمی ہے اور میرا بھتیجا بھی۔ تو کیا میں اپنے ان زیوروں کی زکوٰۃ انہیں دے دوں تو کافی ہے؟

جواب: آپؐ نے جواب دیا:

''ہاں۔''

زکوٰۃ کے علاوہ مال پر حق

سوال: یارسول اللہؐ! کیا مال میں زکوٰۃ کے سوا بھی اور حق ہے؟

جواب: فرمایا:

''ہاں ہے۔''

سنو قرآن فرماتا ہے:

(''نیکی صرف یہ نہیں ہے کہ تم (نمازوں میں) اپنے چہرے مشرق ومغرب کی جانب کرلو بلکہ درحقیقت نیک، صالح آدمی وہ ہے جو اللہ تعالیٰ پر، قیامت کے دن پر، فرشتوں، اللہ کی کتاب اور نبیوں پر ایمان رکھنے والا ہو) اور وہ مال سے محبت رکھنے کے باوجود اسے قرابت داروں، یتیموں، مسکینوں (غریبوں) مسافروں، مانگنے والوں اور غلاموں کو آزادی دلانے میں خرچ کرے اور نماز قائم کرے اور فرض زکوٰۃ ادا کرے اور یہی وہ لوگ ہوتے ہیں جو اپنے عہد معاہدوں کو اس وقت پورا کرتے ہیں جب وہ وعدے کرلیں.....الخ'' (البقرہ ۱۷۷)

شہد پر زکوٰۃ

سوال: ابن ماجہ میں ہے کہ حضرت ابوسیارہؓ نے نبیؐ سے کہا: شہد کی مکھیوں کے چھتے میرے پاس ہیں (تو کیا میں شہد کی زکوٰۃ ادا کروں؟)

جواب: آپؐ نے فرمایا:

''اس میں سے دسواں حصہ ادا کرتے رہو۔''

انہوں نے کہا: پھر انہیں میرے حق میں محفوظ کردیا جائے۔ آپؐ نے ایسا ہی کیا۔ مدینہ منورہ کے مضافات میں ایک جنگل تھا جس کے درختوں پر شہد کے چھتے مکھیاں لگاتی تھیں۔ یہ جنگل مملکت اسلامیہ کی ملکیت تھا۔ ابوسیارہؓ نے نبی مکرمؐ سے اس زمین کا ٹھیکہ طلب کیا تھا، جو آپؐ نے انہیں دے دیا۔

مال پر سال پورا ہونے سے قبل زکوٰۃ ادا کرنے کی اجازت

سوال: حضرت عباسؓ نے آپؐ سے دریافت کیا: کیا سال گزرنے سے پہلے میں زکوٰۃ دے دوں؟ آپؐ نے انہیں اس کی اجازت مرحمت فرمائی۔

صدقۃ الفطر

سوال: یارسول اللہؐ زکوٰۃِ فطر کا کیا حکم ہے؟

جواب: ارشاد فرمایا:

''ہر مسلمان پر، چھوٹے پر، بڑے پر، آزاد پر، غلام پر ایک صاع ہے، کھجور کا یا جو کا یا پنیر کا۔'' (یعنی ہر ایک پر واجب ہے)

محصلین اور مال زکوٰۃ سے متعلق حکم

سوال: مالدار لوگ پوچھتے ہیں کہ زکوٰۃ کے تحصیل دار ہم پر زیادتی کرتے ہیں تو ان کی زیادتی کے انداز سے ہم اپنا مال اُن سے چھپالیں؟

جواب: فرمایا:

''نہیں۔''

سوال: ایک شخص رسول اللہؐ سے سوال کرتا ہے کہ میں مالدار ہوں، ساتھ ہی عیالدار بال بچوں والا ہوں ۔ مجھے بتلایئے کہ کیسے خرچ کروں اور کیا کروں؟

جواب: آپؐ نے فرمایا:

''اپنے مال کی زکوٰۃ، وہ پاکیزگی ہے جو تجھے پاک وصاف کردے گی ۔صلہ رحمی کر اور اپنے رشتہ داروں کی خبر گیری کر، سائل کا، پڑوسی کا، مسکین کا حق پہچان۔''

اس نے کہا: اے اللہ کے نبیؐ! میرے لئے تو ان لفظوں میں کچھ کمی کیجئے ۔ آپؐ نے یہ آیت تلاوت فرما دی :وَاٰتِ ذَاالْقُرْبٰی حَقَّہٗ وَالْمِسْکِیْنَ وَ ابْنَ السَّبِیْلِ وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِیْرًا (اسراء ۲۶)

''قرابت داروں کو ان کا حق پہنچا اور مسکین کو اور مسافر کو اور اسراف و فضول خرچی نہ کر'' اس نے کہا: بس یہ کافی ہے ۔ پھر پوچھتا ہے کہ یارسول اللہؐ جب میں اپنی زکوٰۃ آپؐ کے قاصدوں کو دے دوں تو میں اللہ اور رسول کے نزدیک بری ہوگیا؟ آپؐ نے فرمایا:

''ہاں جب تو میرے قاصد کو دے دے تو تُو اس سے بری ہوگیا۔ تیرا اجر ثابت ہوگیا، پھر اسے جو بدل ڈالے اس پر گناہ رہے گا۔''

آل نبیؐ پر صدقات وزکوٰۃ کی حرمت

سوال: آپؐ سے سوال ہوتا ہے کہ آپؐ کے مولیٰ (آزاد کردہ غلام) حضرت ابورافعؓ کو ہم صدقہ دے سکتے ہیں؟

جواب: آپؐ فرماتے ہیں:

''ہم آل محمد ﷺ ہیں ہمارے لئے صدقہ حلال نہیں، قوم کا مولیٰ بھی انہی میں سے ہے۔''

اپنا مال وقف کرنے کا حکم

سوال: حضرت عمرؓ ارادہ کرتے ہیں کہ اپنی خیبر والی زمین سے قربِ الٰہی حاصل کریں ۔آپ نبی کریمؐ سے دریافت کرتے ہیں کہ میں کس طرح کروں؟

جواب: آپؐ فرماتے ہیں:

''اگر چاہو تو اصل روک کر صدقہ کردو یعنی وقف کردو۔''

چنانچہ حضرت عمرؓ نے یہی کیا۔

حضرت عبداللہ بن زیدؓ نے اپنا باغ راہِ الٰہی میں دے دیا، ان کے والدین رسول اللہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہا: اے اللہ کے نبی! ہماری روزی کا ظاہر ذریعہ تو صرف یہی تھا۔ اس کے سوا ہمارے پاس تو کوئی مال نہیں۔آپؐ نے اسی وقت حضرت عبداللہؓ کو بلوایا اور فرمایا:

''اللہ کے ہاں تیرا صدقہ تو قبول ہوگیا اور وہ تیرے ماں باپ پر واپس ہے۔''

چنانچہ اس کے بعد وہ ان کے ماں باپ کے پاس ہی رہا۔

افضل صدقہ

سوال: رسول اللہؐ سے دریافت کیا جاتا ہے: کون سی خیرات افضل ہے؟

جواب دیتے ہیں:

''تحفہ دینا، اس طرح کہ تم میں سے کوئی درہم یا سواری کے جانور یا دودھ کے لئے بکری یا گائے تحفہ دے دے۔''

سوال: اسی سوال کے جواب میں ارشاد ہے:

''باوجود مال کی کمی کے صدقہ کرنا اور سب سے پہلے اپنے عیال سے شروع کرو۔''

سوال: یہی بات ایک اور مرتبہ پوچھی جاتی ہے

جواب: جواب دیتے ہیں:

''صحت اور مال کی چاہت، مسکینی کے خوف اور امیری کی تمنا کے وقت کی خیرات سب سے افضل ہے۔''

سوال: یہی سوال ایک اور موقع پر پوچھا گیا

جواب: فرمایا:

''پانی پلانا بھی افضل درجہ ہے۔''

سوال: اسی سوال کے جواب میں ایک بار فرمایا:

''پانی پلانے کا صدقہ سب سے افضل ہے۔''

سوال: حضرت سراقہ بن مالکؓ پوچھتے ہیں کہ میرے حوض پر کسی کے اونٹ آ کر پانی پی جائیں تو مجھے ثواب ملے گا؟

جواب: فرماتے ہیں:

''ہاں! ہر ایک گرم کلیجے میں اجر ہے۔'' (اس لئے کہ جب کوئی جانور پانی پیے گا تو اس کا پیاس کی وجہ سے گرم کلیجہ، ٹھنڈا ہوگا۔)

نہایت قریبی رشتے داروں کو صدقہ

سوال: دو عورتوں نے پوچھا: کیا وہ اپنا صدقہ اپنے خاوندوں کو دے سکتی ہیں؟

جواب: آپؐ نے فرمایا:

''ہاں انہیں دوہرا اجر ملے گا، ایک قرابت داری کا اجر اور دوسرا صدقہ کا اجر۔''

ابن ماجہ میں ہے: کیا میں اپنے خاوند کو اور اپنے ہاں پلنے والے یتیموں کو صدقہ دے دوں تو کافی ہے؟ آپؐ نے فرمایا:

''اس کے لئے دو اجر ہیں، صدقے کا اور قرابت کا۔''

صدقہ، خیرات کی ترغیب

سوال: حضرت اسماءؓ پوچھتی ہیں کہ میرے پاس سوائے اس کے جو حضرت زبیرؓ مجھے دیں اور مال تو ہے نہیں تو کیا میں صدقہ کروں؟

جواب: آپؐ فرماتے ہیں:

''ہاں! صدقہ کر روک نہ رکھ، ورنہ اللہ بھی تم سے روک لے گا۔ جہاں تک ہو سکے لوگوں میں خیر خیرات تقسیم کرتی رہ۔''

سوال: آپؐ سے معروف کے بارے میں پوچھا گیا

جواب: فرمایا:

''کسی نیکی کو ہلکی نہ گنو، چاہے ایک رسی کا ٹکڑا دے دو یا جوتی کا تسمہ، چاہے تم اپنے ڈول میں سے کسی پیاسے کو پانی ہی پلا دو یا راستے سے کسی ایذا دینے والی چیز کو دور ہٹا دو یا کسی مسلمان سے خندہ پیشانی سے ملاقات کرو یا کسی مسلمان سے سلام کرو یا کسی انجان کی وحشت کو دور کر دو۔''

قارئینکرام! تمہیں رب کی قسم سچ کہو یہ پاک فتوے کیسے پیارے، کتنے پسندیدہ، کس قدر نفع دینے والے اور کیسے جامع ہیں! واللہ! اگر لوگ اپنی توجہ اسی طرف کر لیں تو پھر نہ انہیں دوسروں کے فتووں میں یہ نورانیت نظر آئے نہ یہ لذت پائیں، نہ یہ حلاوت ملے نہ اس کی ضرورت رہے کہ فلاں نے یہ فتویٰ دیا اور فلاں نے یہ۔ اللہ ہماری مدد فرمائے اور اپنے نبیؐ کے کلام کی جستجو کی توفیق دے اور اس پر عمل کرنے کی بھی، آمین!

غلام، نوکر کا اپنے مالک کے مال سے صدقہ کرنا

سوال: ایک غلام آپؐ سے پوچھتا ہے: کیا میں اپنے مالک کے مال سے خیرات کر سکتا ہوں؟

جواب: فرمایا:

''ہاں! ثواب تم دونوں میں آدھوں آدھ ہے۔''

صدقے کا مال واپس لینے والے کا حکم

سوال: حضرت عمرؓ نے ایک گھوڑا راہِ الٰہی میں دیا، پھر نبیؐ سے پوچھا کہ خریدار اسے فروخت کرتا ہے کیا میں خرید لوں؟

جواب: آپؐ نے فرمایا:

''نہ خریدو (اپنے صدقے کو واپس نہ لو) گو وہ تمہیں ایک درہم کا ہی دے۔ اپنے صدقے کو واپس لینے والا ایسا ہے جیسے کوئی کتا قے کر کے چاٹ لے۔''

سوال: ایک صحابی آپؐ سے کہتے ہیں کہ میں نے خیرات کا ایک غلام اپنی والدہ کو دیا تھا، اب ان کا انتقال ہو گیا ہے؟ (تو.....غلام کا کیا کریں؟)

جواب: آپؐ نے فرمایا:

''تیرے صدقے کا ثواب تجھے مل گیا اور اب بطور ورثے کے وہ تیری چیز ہے۔''

سوال: ایک عورت آپؐ سے کہتی ہے کہ میں نے اپنی ماں کو ایک لونڈی دی تھی، اب وہ فوت ہو گئیں (تو.....اس لونڈی کے بارے میں کیا حکم ہے؟)

جواب: آپؐ نے فرمایا:

''تیرا اجر واجب ہوگیا اور میراث نے اس لونڈی کو اب پھر تیری لونڈی بنا دیا۔''

فوت شدگان کی طرف سے صدقہ

سوال: ایک صحابی نے سوال کیا: میری والدہ فوت ہوگئی ہیں اور میرا خیال ہے کہ اگر وہ بولتیں تو صدقہ کرنے کا کہتیں۔ اگر میں صدقہ کروں تو اس کو نفع ہوگا؟

جواب: فرمایا:

''ہاں۔''

سوال: یارسول اللہؐ! میری والدہ فوت ہوگئی ہیں، میرا خیال ہے کہ اگر وہ (وفات سے قبل) بولتیں تو ضرور صدقہ کرنے کو کہتیں اگر میں ان کی طرف سے صدقہ کروں تو کیا اس کا ثواب انہیں ملے گا؟

جواب: آپؐ نے فرمایا:

''ہاں''

(ان دونوں روایات میں صرف الفاظ کا فرق ہے، مفہوم دونوں کا ایک ہے۔)

سوال: یارسول اللہؐ! میرے والد انتقال کر گئے ہیں۔ کوئی وصیت انہوں نے نہیں کی۔ میں ان کی طرف سے اگر صدقہ کروں تو کیا انہیں ثواب پہنچے گا؟

جواب: فرمایا:

''ہاں، پہنچے گا۔''

اسلام لانے کے بعد ایام جاہلیت کی نیکیوں کا حکم

سوال: حکیم بن حزامؓ کہتے ہیں: یارسول اللہؐ! زمانہ جاہلیت میں جو میں نیکی کیا کرتا تھا، صلہ رحمی، غلاموں کی آزادی، صدقہ وغیرہ تو کیا مجھے اب جب کہ میں مسلمان ہوگیا ہوں، ان کا بدلہ ملے گا؟

جواب: آپؐ نے فرمایا:

''جو نیکیاں تو نے کی ہیں وہ سب اسلام لانے کے بعد بھی تجھے ملیں گی۔''

سوال: حضرت عائشہ صدیقہؓ آپؐ سے دریافت کرتی ہیں کہ ابن جدعان جاہلیت کے زمانے میں صلہ رحمی کرتا، مسکینوں کو کھانا دیتا تھا تو کیا اسے کچھ نفع ہوگا؟

جواب: آپؐ نے فرمایا:

''اسے کچھ نفع نہ ہوگا اس لئے کہ اس نے پوری عمر میں کسی دن نہیں کہا کہ الٰہی قیامت کے دن میرے گناہ معاف فرما دینا۔''

مانگنے کی حرمت

سوال: یارسول اللہؐ! وہ تونگری کیا ہے جس کے بعد سوال کرنا حرام ہو جاتا ہے؟

جواب: فرمایا:

''پچاس درہم یا اس کی قیمت کا سونا۔''

اور روایت میں ایسے سوال کا جواب ہے کہ صبح و شام کا کھانا۔ ان دونوں جوابوں میں کوئی منافات نہیں، کیونکہ یہ ایک دن کی تونگری ہے اور وہ عام حالات پر نظر ڈال کر سال بھر کی تونگری ہے۔ یہ جواب باختلافِ حالِ سائل جداگانہ ہوتے تھے، واللہ اعلم۔

بغیر مانگے کسی کی طرف سے ملنے والے مال کا حکم

سوال: رسول اللہؐ نے حضرت عمرؓ کے پاس ایک عطیہ بھیجا۔ عمرؓ دوڑے بھاگے نبیؐ کے پاس پہنچ کر کہنے لگے کہ آپؐ نے تو فرمایا تھا: اس میں کوئی بھلائی نہیں کہ تم میں سے کوئی کسی سے کچھ لے۔

جواب: آپؐ نے فرمایا:

''یہ اس وقت ہے جب سوال کیا ہو۔ اور بے سوال کئے جو مل جائے وہ تو اللہ تعالیٰ کا دیا ہوا رزق ہے۔''

تب عمرؓ نے فرمایا: واللہ! نہ میں کسی سے کچھ مانگوں گا اور نہ بے مانگے آئی ہوئی چیز کو واپس لوٹاؤں گا۔

مہمان داری کے مسائل

سوال: حضرت عقبہ بن عامرؓ کہتے ہیں: یارسول اللہؐ! آپ ہمیں کام کاج کو بھیجتے ہیں۔ ہم کہیں جا کر قیام کرتے ہیں، وہ لوگ ہماری مہمانداری ہی نہیں کرتے تو فرمائیے اُس وقت ہمیں کیا حکم ہے؟

جواب: فرمایا:

''جب تم کسی قوم میں اُترو اور وہ تمہارے لئے وہ انتظام کر دیں

جومہمان کے لئے ہونا چاہیے تو تم قبول کرو اگر نہ کریں تو پھر تم ان کی حیثیت کے مطابق حق مہمانداری وصول کرلو۔''

سوال: ترمذی شریف میں ہے ہم لوگوں کے پاس اترتے ہیں، وہ نہ ہماری مہمانداری کرتے ہیں، نہ ہمارے حق ادا کرتے ہیں جو ان پر ہیں اور نہ ہم ان سے لیتے ہیں۔

جواب: آپؐ نے فرمایا:

''اگر وہ انکار کریں مگر یہ کہ تم ان سے مہمانی زبردستی لوتو لے لو۔''

فتویٰ: ابوداؤد میں ہے:

''ضیافت کی رات ہر مسلمان پر حق ہے۔ اگر اس کے آنگن پر کوئی محروم رہا تو اس پر قرض ہے اگر چاہے تقاضا کرے اگر چاہے چھوڑ دے۔''

فتوی ابوداؤد میں یہ بھی ہے کہ:

''جو شخص کسی قوم کا مہمان ٹھہرے تو ان پر اس کی مہمانداری ضروری ہے اگر وہ مہمان داری نہ کریں تو اسے حق ہے کہ اپنی مہمانداری جتنا ان سے وصول کرلے بطور سزا کے۔''

وجوبِ ضیافت کی یہ دلیل ہے، اور یہ دلیل ہے اس بات کی کہ جس کا کوئی حق کسی پر ہو اور وہ دینے سے انکاری ہو تو اس کے برابر وہ وصول کرسکتا ہے۔ مسئلہ ظفر کی دلیل بھی اسی سے لی گئی ہے لیکن دراصل اس کی کوئی دلیل اس میں نہیں کیونکہ یہاں پر تو سبب حق ظاہر ہے لینے والے پر کسی قسم کا الزام نہیں آسکتا۔

سوال: حضرت عوف بن مالکؓ آپؐ سے سوال کرتے ہیں کہ ایک شخص کے ہاں میں گیا اور اس نے میری مہمانی نہیں کی۔ اب وہ میرے ہاں آئے تو میں بھی اس کی مہمانی نہ کروں، اس میں کوئی حرج تو نہیں؟

جواب: آپؐ نے جواب دیا:

''نہیں، ایسا نہ کر، بلکہ اس کی مہمانی کر۔''

کہتے ہیں کہ مجھے رسول اللہؐ نے میلی کچیلی حالات میں دیکھ کر مجھ سے دریافت فرمایا:

''تیرے پاس مال ہے؟''

''میں نے کہا: جی ہاں ہر قسم کا مال ہے۔ اللہ نے تجھے اپنی مہربانی سے اونٹ، بکریاں وغیرہ دے رکھی ہیں۔ آپؐ نے فرمایا:

''اس کا اثر بھی تجھ پر ظاہر ہونا چاہیے۔''

سوال: یارسول اللہؐ مہمان کے لئے تکلف کب تک کرنا چاہیے؟

جواب: فرمایا:

''جو شخص اللہ عزوجل اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتا ہے اسے چاہیے کہ اپنے مہمان کی تکریم کرے۔ اس کی خاطر داری بس ایک دن اور ایک رات کی ہے۔ اور ضیافت تین دن رات کی اس کے بعد صدقہ ہے اور کسی کو حلال نہیں کہ دوسرے کے یہاں اتنا ٹھہرے کہ اُسے مشکل پڑ جائے اور وہ اُکتا جائے۔''

سوال: یارسول اللہؐ! میں ایک شخص کے ہاں گیا۔ اس نے نہ میری ضیافت کی، نہ میری مہمانداری، تو کیا جب وہ میرے ہاں آئے میں بھی اس کے ساتھ ایسا ہی کرسکتا ہوں؟

جواب: آپؐ نے فرمایا:

''بلکہ تو اس کی مہمانداری کر۔''

عقیقہ کے مسائل

سوال: عقیقے کی بابت آپؐ سے سوال ہوا تو گویا آپؐ نے یہ نام مکروہ جانا۔

جواب: اور فرمایا:

''جس کے ہاں بچہ تولد ہوا اور وہ ذبیحہ کرنا پسند کرے تو کرلے۔''

دوسری روایت میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا:

''عقوق کو میں پسند نہیں کرتا۔''

گویا کہ اس نام کو آپؐ نے مکروہ سمجھا۔

تو لوگوں نے کہا کہ ہم، ہمارے ہاں جو بچے ہوتے ہیں ان کی بابت سوال کرتے ہیں۔ آپؐ نے فرمایا:

''جس کے بچہ ہوا اور وہ اس کی طرف سے قربانی دینا چاہے تو لڑکے کی طرف سے دو برابر کی بکریاں اور لڑکی کی طرف سے ایک بکری۔''

ماخوذ از فتاویٰ رسول اللہؐ: جو احادیث بیان کی گئی ہیں ان سب کے حوالے اس کتاب میں موجود ہیں۔ ☆

ڈاکٹر محمد آفتاب خان

ہمارا نظامِ تعلیم

اور علامہ اقبال کے فرمودات، ایک جائزہ

برصغیر میں پاکستان کا ایک نظریئے کی بنیاد پر وجود میں آنا، دانشوروں کی نظر میں ایک محیر العقول واقعے بلکہ معجزے سے کم نہیں۔ بیسویں صدی میں مغربی استعمار نے اپنے پنجے براعظم افریقہ اور ایشیا کے بہت بڑے حصے میں مضبوط کر لئے تھے جس کی وجہ سے مختلف نظریات جو الہامی ہدایات سے مطلقاً بے نیاز ہو کر بلکہ اس کی نفی کی بنیاد پر استوار کئے گئے تھے، کا عام چلن تھا۔ ایک ایسے پس منظر میں جبکہ دنیا کے بیشتر ممالک میں نظام سرمایہ داری (capitalism)، وطنیت (Nationalism) اور کمیونزم کا دور دورہ تھا، برصغیر میں کلمہ طیبہ کی بنیاد پر تشکیل پانے والی ایسی مملکت جس کے دو حصوں میں ایک ہزار میل کا فاصلہ تھا اور جو صرف فضائی راستے سے ہی ایک دوسرے سے جڑے ہوئے تھے، کسی معجزے سے کم قرار نہیں دیا جا سکتا۔ بلاشبہ ریاست مدینہ کے بعد یہ دوسری مملکت ہے جو کلمہ طیبہ کی بنیاد پر قائم ہوئی تھی۔

خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِ ہاشمی!

امر واقعہ یہ نہیں کہ مسلمانان ہند، انگریز کے غلام ہونے کے ردعمل کے طور پر انگریزی زبان نہ سیکھ سکے اور یوں انہیں برطانوی دور میں حکومتی منصب میں مناسب کوٹہ نہ مل سکا جیسا کہ مختلف انگریز، ہندو اور مسلمان تاریخ دان حضرات کا خیال ہے۔ اس طرح یہ بھی ایک بہت بڑا تاریخی معاملہ ہے کہ جو جدوجہد آزادی کا نقطۂ آغاز ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی یا بقول انگریز، ہندو مصنفین ''غدر (MUTINY)'' قرار دیا جاتا ہے۔ اس کے برعکس انگریز سے آزادی حاصل کرنے کا آغاز جنگ پلاسی ۱۷۵۷ء سے ہوتا ہے جبکہ انگریز نے بنگال میں پہلی مرتبہ اپنی حکومت قائم کی۔ مسلمانوں نے جدوجہد آزادی اس وقت سے شروع کی جو بلا کسی انقطاع کامل ایک صدی ۱۸۵۷ء تک جاری رہی۔ یہ مسلمان بادشاہوں کی جنگ نہ تھی بلکہ مسلم عوام اور عطاء کی جنگ تھی جو جذبہ جہاد سے سرشار ہو کر انگریز کے خلاف نبرد آزما رہے!

جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے بعد انگریز نے جو ظلم مسلمانان ہند پر ڈھائے، وہ انگریز قوم کی تاریخ کا ایک ایسا شرمناک باب ہے جس کی مثال چنگیز خان اور ہلاکو کے مظالم کو بھی شرما دینے والی ہے۔ جان و مال کے ظلم سے بڑھ کر جو ظلم انگریز نے ڈھایا اور جس کے اثرات دو صدیوں کے گزرنے کے بعد اب تک چلے آ رہے ہیں، اس کا تعلق اس نظام تعلیم سے ہے جو انگریز نے ہم پر مسلط کیا۔ اس نظام تعلیم کے نمایاں ترین خدوخال اور اس کے مضمرات کا مختصر جائزہ یہ ہے:

مسلمانوں کا نظام تعلیم خلافت راشدہ سے لے کر انگریز کے دور تک آزاد اور خوکار نظام تھا جو اوقاف اور مسلمان حکمرانوں اور اہل ثروت کی عطایا DONATIONS کے سبب، بغیر کسی خلل اندازی کے چلتا تھا اور جس کے ساتھ ہزاروں اہل علم اور طلباء تعلیم کے شعبے سے وابستہ تھے۔ ۱۸۱۸ء میں لارڈ ولزلی نے ان تمام اوقاف کو ضبط کر لیا اور یوں بقول میکالے جو انگریزی تعلیم کا بانی تھا، ''مسلمانوں کے نظام تعلیم پر اس قانون نے وہ شاہ ضرب لگائی کہ یہ نظام خود بخود ختم ہو گیا۔''

لارڈ میکالے نے ۱۸۳۵ء میں ایک تعلیمی سکیم نافذ کی جس سے عربی، فارسی کی تعلیم بیک قلم منسوخ کر دی گئی۔

انگریزی تعلیم کے نتیجے میں جو لوگ تعلیم حاصل کر کے نکلے وہ لارڈ میکالے کے تصور کے عین مطابق تھے۔ بقول شیخ محمد اکرم ''ایک طرف ہندوؤں کے کالجوں سے پکے ہندو اور سادہ مزاج طلبہ پیدا ہو رہے تھے تو دوسری طرف علی گڑھی سے ''کالے انگریز'' پیدا ہو رہے تھے جن کی نمایاں ترین خصوصیات یہ تھیں کہ وہ اپنے اسلاف کے فکر و عمل سے یکسر

مختلف تھے، یہ لوگ دین کی ابتدائی معلومات کو کافی تصور کرتے تھے اور علماء سے حصول دین کے قائل نہ تھے بلکہ ان کی تحقیر کرتے تھے، ''مقصد'' کا لفظ بطور تحقیر ان لوگوں کی ہی ایجاد ہے اور یہ لوگ مادیت پسندی کے دلدادہ، ان کی علمی دنیا ویران اور ان کا مطمع نظر ذاتی زندگی کی خوشحالی تھا، خواہ قومی مفاد کی شاخ مرجھا ہی کیوں نہ جائے۔''

عربی اور فارسی زبانوں کے بارے میں ہمیں یہ باور کرایا گیا کہ یہ دونوں زبانیں پسماندہ اور غیر ترقی یافتہ اقوام کی زبانیں ہیں لیکن یہ لوگ اس امر حقیقی کو بھول گئے کہ یہ دونوں زبانیں ، انگریزی سے ہزاروں سال پہلے نہ صرف بولی جاتی تھیں بلکہ عملی اور سرکاری زبان کے طور پر رائج تھیں۔ مسلمانوں نے اس برصغیر پر انگریزوں کی آمد سے قبل آٹھ سو سال تک حکومت کی۔ یہاں کی سرکاری زبان فارسی رہی، مدارس میں عربی کی تعلیم دی جاتی تھی۔ حتیٰ کہ مرہٹوں اور سکھوں کی علاقائی حکومتوں اور راجواڑوں میں بھی سرکاری زبان فارسی ہی تھی!

عربی اور فارسی زبانوں کی اہمیت و ضرورت مسلمانوں کے نزدیک کسی وضاحت کی محتاج نہیں۔ ہمارا سارا دین لٹریچر ان زبانوں میں ہے جس کو پڑھ کر نوجوان نسل کی دینی اور عملی شخصیت کی تعمیر مکمل ہوتی ہے۔ ان زبانوں کے ذریعے ان کا شاندار ماضی محفوظ تھا ..... ان زبانوں کی وجہ سے وہ عالم اسلام کے ساتھ مربوط رہتے تھے۔ لارڈ میکالے کے اس ایک اقدام نے نئی نسلوں کو ان کے دین، ان کے شاندار ماضی اور مستقبل میں برادر اسلامی ممالک سے کاٹ کر رکھ دیا..... یہی وہ بات ہے جس کے بارے میں اقبالؒ نے یوں کہا:

اے تہی از ذوق و شوق و سوز و درد
می شناسی عصرِ ما، با ما چہ کرد؟
عصرِ ما، رازِ ما بیگانہ کرد
از جمالِ مصطفیٰؐ بیگانہ کرد!

جمال مصطفیٰؐ سے یہی بیگانگی موجودہ نسل کی شدت پسندی یا دہشت گردی کا سب سے بڑا سبب ہے کہ وہ اس رول ماڈل سے تہی دست ہو گئے جو محمد الرسول اللہؐ کی شخصیت میں کیا بچہ، کیا جوان، کیا بوڑھا، سب کے دلوں کو گرمائے رکھتا تھا اور انہیں کسی ایسے فعل کو سرانجام دینے کی اجازت نہ دیتا تھا جس سے ملک و ملت کو شرمندگی کا سامنا کرنا پڑے! اور یہی وہ پس منظر ہے جس سے متاثر ہو کر علامہ اقبالؒ نے ملک و ملت کے تعلیمی اداروں میں درس تعلیم دینے والوں سے نہایت دردمندی سے کہا:

دل توڑ گئی ان کا دو صدیوں کی غلامی
کر چارہ کوئی ان کی پریشاں نظری کا
تو ان کو سکھا خارہ شگافی کے طریقے
مغرب نے سکھایا انہیں فن شیشہ گری کا

نظام تعلیم کا یہ سلسلہ یہاں پر ہی ختم نہیں ہوتا۔ انگریز نے تو ہمارا تعلق عربی و فارسی سے منقطع کر کے ہمیں اپنے ماضی سے کاٹ دیا تھا تاہم انگریز کے پروردہ ''کالے بابوؤں'' نے قیام پاکستان کے بعد ہمیں ایک تیسری اہم ترین مادری زبان (اردو) سے بھی بے بہرہ کر دیا۔ اہل علم سے یہ امر پوشیدہ نہیں کہ عربی، فارسی کے بعد قرآن و حدیث اور دیگر اسلامی علوم و فنون پر جس قدر بھی کام ہوا ہے، وہ اردو زبان میں سر انجام پایا۔ انہی دو صدیوں میں ہزاروں کتب و رسائل، مقالہ جات، نظم و نثر کی صورت میں ہماری تاریخ اور تہذیب و تمدن کے مختلف پہلوؤں پر لکھے گئے حتیٰ کہ طب کے چند مشکل ترین مضامین علم تشریح الاعضاء (anatomy) اور جینیات (Genetics) پر بھی درسی کتب اردو زبان میں جامعہ عثمانیہ دکن نے شائع کیں اور وہاں اعلیٰ تعلیم و تدریس بھی اردو زبان میں دی جاتی تھی۔

اس تمام تر صورت حال کا منطقی نتیجہ ہمارے سامنے ہے کہ آج کا تعلیم یافتہ نوجوان (بشمول اساتذہ کرام) دینی شعار آگاہی نہیں رکھتا اور اس کی انتہا یہ ہے کہ سکولوں کا تو شمار ہی کیا، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں جو نسل زیر تعلیم ہے، وہ اپنے قریب ترین مشاہیر کے محکوم آور فکر سے آگاہ نہیں۔ ہر قوم اپنی تاریخ کو بھلا دیتی ہے اس کا جغرافیہ بھی قائم نہیں رہتا۔ تاریخ کا یہ ایک بدیہی سبق ہے جس سے حرفِ نظر خطرناک ترین نتائج کا حامل ہو سکتا ہے۔

وطن عزیز میں پائے جانے والی موجودہ غیر یقینی کیفیت نوجوان

نسل میں تحمل و برداشت کی کمی اور بے سمتی جیسے عوارض کا واحد سبب یہی نظام تعلیم ہے۔ امریکہ کے سامنے اپنے فدویانہ اظہار عبودیت اور نیاز مندی میں فوجی جرنیل سے لے کر ایک سیاستدان، دانشور اور ماہرین تعلیم سبھی شامل ہیں۔ مغربی تعلیم وتہذیب کا غمزۂ خون ریز اس قدر ہمہ گیر اثرات کا حامل ہے کہ اس نے اللہ والوں کی متاع دین ودانش بھی لوٹ لی ہے:

متاعِ دین ودانش لٹ گئی، اللہ والوں کی
یہ کس کافر ادا کا غمزۂ خوں ریز ہے ساقی!

دوسری طرف ہمارا دینی تعلیم کا موجودہ نظام ہے جس کو سمجھنے کے لئے بھی ہمیں تاریخ کو جاننا پڑے گا۔

اگرچہ انگریزی تعلیم وتربیت نے مسلمان نوجوان نسل کو آزاد خیالی اور الحاد ولادینی کی راہ پر ڈال دیا تھا تاہم اسی دور میں برصغیر میں ایسے رجال عظیم پیدا ہوئے جنہوں نے وسائل کی شدید کمی، برطانوی استعمار کے معاندانہ رویہ اور مسلمانان ہند کی مالی، اخلاقی اور دینی زبوں حالی کے باوجود اس امت کا رشتہ، کم از کم نظریاتی طور پر ہی سہی، اسلام کے ساتھ استوار رکھا۔ موجودہ مذہبی تعلیم، مجدد الف ثانیؒ اور ان کے بعد شاہ ولی اللہ دہلوی کا علمی ورثہ ہے۔ اس گروہ میں حاجی امداد اللہ مہاجر مکی، مولانا محمد قاسم نانوتوی مولانا گنگوہی کے علاوہ ہزار ہا ایسے اہل علم شامل ہیں جنہیں انگریز نے اپنے استعمار کو تقویب دینے کے لئے کالا پانی (جزائر انڈیمان) میں مختلف اقسام کی سزائیں دیں، سینکڑوں افراد کو پھانسی پر چڑھایا اور لاکھوں افراد کی جائیدادیں ضبط کیں۔

اگرچہ یہ تمام افراد جہاد میں ناکامی کی وجہ سے کمزور ہو گئے تھے مگر انہوں نے شکست تسلیم نہ کی اور نہ ہی موجودہ حکمرانوں کی طرح انگریز کے حضور سجدہ ریز ہوئے اور قائداعظم کے ایک رفیق خاص سید شبیر احمد عثمانی کے بقول ''یہ طبقہ شاہراہ سیاست سے کٹ کر مدرسوں، خانقاہوں میں جا پہنچا اور امت مسلمہ کے دینی اور علمی ورثے کو مضبوط کرنے میں مصروف عمل ہو گیا۔'' مزید برآں اگر یہ کہا جائے کہ جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کی ناکامی کے نتیجے میں ہونے والی مایوسی کو ختم کرنے کے لئے اور انگریزی نظام سے نفرت کے اظہار کے طور پر ان خرقہ پوشوں نے اپنے لاکھوں شاگردوں کی مدد سے اس دینی ورثے کی حفاظت کا جو بندوبست کیا، وہ دراصل ذہنی اور علمی سطح پر انگریز کے نظام سے بے زاری کا اظہار تھا، تو یہ کہنا بھی بے جا نہ ہوگا!

بعد کے ادوار میں مسلمانوں میں تعلیمی نظام کے یہ دو دھارے قائم ہو گئے جن کے باعث اہلِ مدرسہ جدید علوم سے لاتعلق ہونے لگے اور جدید تعلیم حاصل کرنے والے اپنے دینی ورثے سے بے بہرہ ہوتے چلے گئے۔ اہل علم بالخصوص علامہ اقبالؒ نے اس نظام تعلیم کی خرابیوں اور نقائص سے کماحقہ آگاہ کیا ہے۔

اٹھا میں مدرسہ و خانقاہ سے نمناک
نہ زندگی، نہ محبت، نہ معرفت، نہ نگاہ!

ایک دوسری جگہ فرمایا

میرِ سپاہ نا سزا، لشکریاں شکستہ صف
آہ وہ تیرِ نیم کش جس کا نہ ہو کوئی ہدف!

مزید ایک جگہ فرمایا

میں نے اے میرِ سپہ، تیری سپہ دیکھی ہے
قل ھو اللہ کی شمشیر سے خالی ہے نیام!

علامہ اقبال نے ہر دو اقسام کے تعلیمی نظاموں (مغربی اور مذہبی) پر یکساں تنقید کرتے ہوئے ان خامیوں کی نشاندہی کی ہے جس کے نتیجے میں آج کا موجودہ نوجوان بے سمتی کا شکار ہو گیا ہے۔

شکایت ہے مجھے یارب خداوندان مکتب سے
سبق شاہین بچوں کو دے رہے ہیں خاکبازی کا

مسجد ومکتب کو علامتی طور پر دو اقسام کے تعلیمی نظاموں سے تشبیہہ دیتے ہوئے فرمایا

کس کو معلوم ہے ہنگامۂ فردا کا مقام
مسجد و مکتب و مے خانہ ہیں مدت سے خموش
صاحبِ ساز کو لازم ہے کہ غافل نہ رہے
گاہے گاہے غلط آہنگ بھی ہوتا ہے سروش!

عصرِ حاضر کے عنوان سے ضربِ کلیم میں فرمایا

مدرسہ عقل کو آزاد تو کرتا ہے مگر
چھوڑ دیا ہے خیالات کو بے ربط ومقام
مردہ لا دینی افکار سے افرنگ میں عشق
عقل بے ربطی افکار سے مشرق میں غلام!

مزید فرمایا

حرف اس قوم کا بے سوز، عمل زار وزبوں
ہو گیا پختہ عقائد سے تہی جس کا ضمیر

اس جگہ مزید سوال پیدا ہوتا ہے کہ مغربی اور مذہبی تعلیم کے ان پیش کردہ مقاصد اور کمزوریوں کا علاج کیا ہے جس نے ہماری نوجوان نسل کو موجودہ بے راہ روی کا شکار بنا دیا ہے؟ علامہ اقبالؒ کے روز وشب بھی اس سوال پر مرکوز رہتے تھے۔

علامہ اقبالؒ کے نزدیک امت مسلمہ کی موجودہ زبوں حالی کا علاج اور امت مسلمہ کی تعمیر وترقی کیلئے یہ امر بہت ضروری ہے کہ دینی تعلیم و تربیت کے ذریعے انہیں زندگی کے اعلیٰ ترین نصب العین اور مقصد کیلئے تیار کیا جائے، اس کے بعد علومِ مغرب سے استفادہ کرنا اس کے لئے مفید ثابت ہوسکتا ہے، اس کے بغیر یہ سراسر گمراہی ہے۔ یہ واضح ہے کہ کسی اعلیٰ نصب العین کے بغیر کسی قسم کی ترقی کا جو صرف اور صرف نوجوان نسل کے ذریعے ہی لائی جاسکتی ہے، خواب بھی نہیں دیکھا جا سکتا۔ درج ذیل فارسی رباعی میں اقبالؒ کے سوزِ دروں اور تڑپ کا اندازہ کیجئے اور پھر اس آہ وزاری کا جو جواب پردہ غیب سے ملا ہے، اس پر موضوع زیر بحث کے حوالے سے غور کیجئے تو یقیناً آپ بھی اس نتیجے پر پہنچیں گے جس پر حضرت علامہ اقبالؒ خود پہنچے تھے۔

شبے پیشِ خدا بگریستم زار
مسلماناں چرا زارند وخوارند
ندا آید نمی دانی کہ ایں قوم
دلے دارند و محبوبے ندارند!

ضرورت ہے کہ آج کے نوجوان کو جس کا دل صدیوں پرانے نظام ہائے تعلیم کے تحت ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہے اسے اس کے محبوب (محمد مصطفیٰؐ) سے روشناس کرایا جائے۔ موجودہ نسل کو جمال مصطفیٰؐ سے روشناس کرانے سے ہی انہیں ایک طرف عدم رواداری اور تشدد کے اس جان لیوا مرض سے بچایا جا سکتا ہے جس میں وہ آج کل مبتلا ہیں اور دوسری طرف مغربی علوم حاصل کرنے کے باوجود اپنی خودی کو برقرار رکھنے کی صلاحیت پیدا ہوسکتی ہے۔ اس کے علاوہ کوئی اور علاج اس ناسور کا ممکن نہیں۔ ساٹھ، ستر سال تک مختلف تجربات کرنے کے بعد اگر ہم آج بھی سنبھل جائیں اور صحیح منزل کی جانب رخ کرلیں تو ہمارے مسائل حل ہوسکتے ہیں۔

یہ کام کیسے سرانجام دیا جاسکتا ہے؟ اگرچہ اس کام کیلئے تو حکومتی ذرائع ووسائل کی ضرورت ہے تاہم نظریہ پاکستان کے تحفظ کے لئے جو کوششیں پاکستان میں کی جارہی ہیں، انہیں تسلسل کے ساتھ جاری و ساری رکھنے کی ضرورت ہے۔ اس مقصد کے لئے مستقل مزاجی کے ساتھ ریڈیو، ٹیلی ویژن، فلم اور دیگر ذرائع ابلاغ سے کام لیتے ہوئے، تعلیمات اقبالؒ وقائدؒ کو بار بار اجاگر کرنے کی ضرورت ہے۔ ہمارے قومی وجود کے لئے ضروری ہے کہ تخلیق پاکستان کے مقاصد اور ان کے حصول کی خاطر کی گئی جدوجہد اور قربانیوں سے نوجوان نسل کو روشناس کرایا جائے۔

وہی دیرینہ بیماری، وہی نامحکمی دل کی
علاج اس کا وہی آبِ نشاط انگیز ہے ساقی!

☆.....☆.....☆

نعت

دونوں عالم کے لئے رحمتِ یزداں تو ہے
شافعِ حشر ہے تو ، ہادی دوراں تو ہے

زیب دیتا ہے تجھے رحمتِ عالم کا لقب
جو ہے اللہ کا محبوب، وہ انساں تو ہے

کون ہے جس سے رہا ربطِ دل وجاں ایسا
جس سے رہتا ہے سدا ربطِ دل و جاں تو ہے

نغمہ شوق میں کھلِ جاتے ہیں یادوں کے گلاب
روح میں جس کی ہے خوشبو وہ گلستاں تو ہے

یاد آتے ہیں شب و روز حرم کے منظر
روز و شب جس نے کیا لطف ِ فراواں، تو ہے

میں کسی حال میں مایوس نہیں ہو سکتا
مجھ کو معلوم ہے نزدیک رگ جاں تو ہے

محترم مجھ کو کیا تیری ثنا خوانی نے
میرے افکارکے پردے میں نمایاں تو ہے

ساتھ چلتے ہیں مرے ابرِ کرم کے سائے
جس کی رحمت کا مرے سر پہ ہے داماں تو ہے

محور فکر و نظر ہے تری ذاتِ اقدس
میرے نغموں کا ، مری زیست کا عنواں تو ہے

قلب مضطر کو ملی سوز کی دولت تجھ سے
میری پلکوں پہ ہوا جس سے چراغاں تو ہے

تیری سیرت نے ہمیں نورِ بصیرت بخشا
جس سے تابندہ ہوا غمکدہِ جاں ، تو ہے

رخِ زیبا سے ہے زیبائیِ عالم کو فروغ
تجھ سے ہے رنگ ِ چمن ، حسنِ بہاراں توہے

گوشہِ چشم کرم سوئے غریباں حالاں
کشتیِ ملت بیضا کا نگہباں تو ہے

حافظلدھیانوی

غزل

میرے ہی جسم و جان کا مجھ پر ہی وار چل گیا
میری ہی آستین میں میرا وجود پل گیا

مجھ کو جلا کے اس کا زخم اور ہی پھول پھل گیا
جتنا میں روشنی بنا اتنا وہ مجھ سے جل گیا

منزل سبھی کی ایک ہے، راہیں جدا جدا سہی
قسمت سے جو جہان میں رہ گیا آج، کل گیا

کلیوں کی مسکراہٹیں، آزارِ جان بن گئیں
رت نے نگاہ پھیرلی رنگ فلک بدل گیا

دیکھے ہیں میری آنکھ نے ایسے بھی کتنے معجزے
جذبوں کے درد و سوز سے لوہا سا تن پگھل گیا

پائی کسی نصیب نے ایسی بھی بد نصیبیاں
روشن ہوئے چراغ سے کوئی چراغ جل گیا

کرنا ہے جو ابھی کرو جو بھی کرو ابھی کرو
کچھ بھی نہ ہاتھ آئے گا وقت اگر نکل گیا

اک تری چشم ملتفت کیسا کمال کر گئی
پہلو میں میرے سنگِ دل، موم بنا، پگھل گیا

رنگ و زبان و نسل کی مسلک و ذات پات کی
کس کی ہمیں نظر لگی کون ہمیں نگل گیا

میرا حلیف صبر تھا ، میرا حریف جبر تھا
چہرۂ حسنِ خُلق پر کون سیاہی مل گیا

صدق و صفا کی راہ میں دل بھی نثار جان بھی
کیا کوئی اور سوئے دار دوڑ کے سر کے بل گیا

کامل تھا جو یقین میں اس کے جمے رہے قدم
جو بھی ہوا بدوش تھا وقت کے ساتھ ڈھل گیا

دیکھو مری زبان پر اب تک کوئی گلہ نہیں
سوچو! اگر کمان سے تیر کوئی نکل گیا

تیری جفائیں بھول کر ایسا لگا حبیبؔ کو
دل میں چبھا ہوا کوئی کانٹا تھا جو نکل گیا

حبیب الرحمٰن

غزل

گونجتی محسوس ہوتی ہیں مجھے شہنائیاں
منتظر لٹنے کی ہیں شائد مری تنہائیاں

روشنی کا ایک بحرِ کراں ہے جس میں ہیں
شو خیاں فکر و تدبر مستیاں ، رعنائیاں

قربتیں پھر دوریاں پھر کشمکش مجبوریاں
چاہتیں پھر وہ تڑپ گہرائیاں گیرائیاں

دل کے ہاتھوں لٹ رہی ہے عقل کی نقدِ حیات
کھل رہی ہیں مجھ پہ جذب وشوق کی پنہائیاں

راستوں میں راستہ شاہینؔ کو یارب مل سکے
زندگی لینے لگی ہے پھر نئی انگڑائیاں

میمونہ شاہینؔ جنجوعہ

غزل

اس بزم میں جو اُن کی جفا بھی شریک ہے
کیوں کر کہوں کہ میری انا بھی شریک ہے

چاہا ہے تجھ کو صورتِ پروانہ بزم میں
یہ اور بات تیری رضا بھی شریک ہے

میں نے کیا ہے عشق سر بزمِ زندگی
میرے لئے دوا میں دعا بھی شریک ہے

پیدا کیا جہان کو محبوب کے لئے
اس جرمِ عاشقی میں خدا بھی شریک ہے

فانی جہاں میں کوئی بھلا دل کو کیا لگائے
ہستی کے ساتھ ساتھ قضا بھی شریک ہے

آئی اس انجمن میں ترنم غزل بہ لب
شہرِ غزل میں نغمہ سرا بھی شریک ہے

ترنم جلالی۔امریکہ

عقیلہ اظہر

لینڈنگ

''آج تو بہت دیر ہوگئی ہے۔'' بلال بالوں میں کریم لگا کر کنگھا کر رہا تھا۔ پھر اپنے لیپ ٹاپ کو بیگ میں بند کرتے ہوئے رانیہ سے کہا ''میرا بلیزر لا دو دوسری الماری میں ہے۔''

رانیہ اپنا سامان پیک کر رہی تھی۔ آج اس کی فلائٹ پر ڈیوٹی تھی۔ ائیر ہوسٹس کا اپنا کام ہی وقت پر ختم نہیں ہو پاتا۔

''لا دو'' بلال نے جوتے کے بند باندھتے ہوئے رانیہ کی طرف دیکھ کر کہا۔

رانیہ کی زبان پر کچھ آتے آتے رہ گیا پھر جلدی سے بلیزر لا کر دے دیا۔ بلال نے اسے دیکھتے ہی ہاتھ پھیلا دیا کہ پہنا دے۔ رانیہ نے دیکھ کر بھی نظر انداز کر دیا اور کوٹ مسہری پر رکھ دیا۔ اس کے پاس وقت کہاں تھا۔ گاڑی کسی بھی لمحہ اسے لینے آنے والی تھی۔ دیر کر کے وہ کوئی خطرہ تو مول نہ لے سکتی تھی۔

ایسے چھوٹے چھوٹے واقعات گھر میں وقوع پذیر ہوتے رہتے تھے۔ رانیہ یہ نوکری اپنی مرضی اور خوشی سے کر رہی تھی اس لئے ہر کام اسے اپنی نوکری سے پیچھے ہی نظر آتا تھا۔

ثانیہ بڑی تھی، اب پندرہ برس کی ہونے کو تھی اور بیٹا 10 سال کا۔ گھر کے کاموں کے لئے اسے ایک عورت مل گئی تھی جو گھر کا تمام کام بہت اچھی طرح کر لیتی تھی۔ ملازمہ شازیہ کی طرف سے اسے اطمینان تھا جب ہی تو وہ ہفتہ بھر کی اڑان بھر لیتی تھی۔ راستے میں کبھی کبھی سب کو بات چیت کرنے کا موقع ملتا تھا تو ہر موضوع پر بات ہوتی۔ ہر دفعہ ٹیک آف اور لینڈنگ پر بات ضرور ہوتی، خصوصاً اسے وہ پائلٹ بالکل ماہر نہ معلوم ہوتا جو لینڈنگ اچھی نہ کرتا اور اگر اچھی نہ ہو تو وہ کہتی کہ جہاز کو پٹخ دیا، smooth نہیں ہے۔

''چائے گرم نہیں ہے'' بلال نے ایک چسکی لے کر پیالی برابر کی میز پر رکھ دی۔

''مائیکرو ویو کر لو'' رانیہ صوفے سے سر ٹکاتے ٹکاتے بولی۔

''مم.....'' وہ ہچکچایا ''میں تو پہلے ہی خاصا لیٹ ہو گیا ہوں۔''

''بھئی سارا دن یہی کام کرتے کرتے بور ہو جاتی ہوں گھر آ کر تو چین لینے دو۔''

''وہاں پر برا نہیں لگتا؟'' بلال نے شکوہ کیا۔

''وہ تو میری ڈیوٹی ہے، پیسے کس چیز کے لیتی ہوں۔'' رانیہ بولی

''یہ کوئی ڈیوٹی نہیں ہے؟'' بلال بولا۔

''ڈیوٹی ہوتی ہے وہ جس کے صلہ میں کچھ ملے، تنخواہ لیتی ہوں اور یہاں.....'' اس کا موڈ بگڑ گیا تھا۔

''اچھا بس'' بلال نے چائے کا کپ اٹھایا اور باورچی خانے کی طرف بڑھ گیا۔ اس نے وہیں چائے گرم کر کے ایک کرسی پر بیٹھ کر پینا شروع کر دی۔

''امی میرے کپڑے چھوٹے ہو گئے ہیں'' مزمل نے ماں کے گلے میں بانہیں ڈال کر کہا۔

''تو ابو کے ساتھ چلے جاؤ لڑکوں کے کپڑے ابو زیادہ آسانی سے لے سکتے ہیں ..... لے جاؤ نا'' اس نے بلال کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''کل چلیں گے۔'' بلال نے مزمل سے کہا۔

''ثانیہ اور مزمل کو بھی لے جانا تا کہ ناپ درست ہو'' رانیہ نے کہا

''تمہاری فلائٹ کب ہے؟''

''کل'' رانیہ اپنے پیروں پر لوشن لگاتے ہوئے بولی۔

''تو پھر آج چلتے ہیں تم بھی چلو نا۔'' بلال اس کام میں اس کا ساتھ چاہتا تھا۔

''آج کچھ آرام ملے گا تو کل کام پر جا سکوں گی۔ تمہاری جوب تو مزے کی ہے نو سے پانچ۔ میری تو ایسی نوکری ہے کہ کئی کئی دن کی

مشقت ہوتی ہے کاش میری بھی ایسی ہی نوکری ہوتی پانچ بجے تک .....اور پھر گھر کے مزے.....'' اس نے احسان جتانے والی نظروں سے بلال کو دیکھا۔

''ایسی نوکریاں تو نکلتی رہتی ہیں دیکھا کرو مل جائے گی۔''

بلال کے چہرے پر تفکر کی چھاپ تھی۔

''اس کے لئے تو بھی وقت چاہئے اور وہی نہیں ہے تم دیکھ لیا کرو۔''

رانیہ کا عذر حاضر تھا۔

'' میں تو بتاتا رہتا ہوں مگر میری بتائی ہوئی کوئی نوکری تمہیں پسند کہاں آتی ہے، درخواست تک نہیں دیتی ہو۔''

''تم جو نوکری بتاتے ہو اس کی تنخواہ میری تنخواہ سے آدھی ہوتی ہے۔ یہ گھر پھر کیسے چلے گا اگر میں یہ رسک لے بھی لوں۔''

''میری اور تمہاری آمدنی سے مل کر گذارا کیا جا سکتا ہے۔ پھر دن رات کی ملازمہ کی ضرورت بھی ختم ہو جائے گی بلکہ میں تو کہتا ہوں کہ اگر تم نوکری نہ بھی کرو تو بھی گزارا ہو سکتا ہے۔''

''گزارا ہو سکتا ہے'' رانیہ نے طنز سے جملہ دہرایا '' اور میں ملازمہ بن جاؤں!''

رانیہ اتنی بددل ہوئی کہ اس کے جسم کا بوجھ صوفہ پر گر پڑا۔ اسے شدت سے احساس ہوا کہ بلال کو اس کی قربانی اور محنت کا ذرا احساس نہیں۔

کچھ دن بعد اس کی پروموشن ہونے والی تھی۔ تنخواہ میں بہت اچھا اضافہ ہونے کی امید تھی۔ وہ دل ہی دل میں پلان بنا رہی تھی۔ پلاٹ کی تمام اقساط تو ادا ہو چکی تھیں اور اب امید تھی کہ اس اضافے سے وہ مکان کی تعمیر شروع کر سکیں گے۔ اس کا یہ خوبصورت خواب تھا جس کی تعبیر دونوں کی محنت سے ہی مل سکتی تھی۔ کم از کم تعمیر کی ابتدا تو ہو سکے گی اور پھر شاید بلال بھی قرض لے لیں۔ وہ سوچتے سوچتے بہت دور نکل گئی تھی۔ پھر اسے بلال کے احمقانہ مشورے یاد آنے لگے۔ اس کی ایسی باتیں رانیہ کے خوابوں کو ملیامیٹ کر دیا کرتی تھیں۔ اسے بعض اوقات اپنی پسند پر بے حد ملال ہوتا۔ والدین کے مناسب وقت پر شادی ہونے کے فارمولے نے اسے ہاں کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ وہ تو خیر ہوئی کہ اس نے اپنی نوکری نہ ترک کرنے کی خواہش شادی سے قبل ہی بلال کو بتا دی تھی۔ بلال تو صرف مقامی کمپنی میں درمیانی سی تنخواہ وصول کرتا تھا جو ایک لوئر مڈل گھرانے کے اخراجات کی ہی کفیل ہو سکتی تھی۔

وہ اکثر سوچا کرتی کہ وہ بلال سے کتنی زیادہ محنت کرتی ہے۔ بلال تو پانچ بجے آ کر گھر پر آرام کرتے ہیں، ٹی وی دیکھتے ہیں، دوستوں سے گپ شپ کرتے ہیں، ہمہ وقتی ملازمہ کی سہولت، کھانا، پانی سب حاضر.....وہ جو سفری مشقت جھیلتی تھی بلال کو کبھی بھی اس کا احساس نہیں ہو سکتا۔ جہاز کے کانٹی نینٹل کھا کھا کر وہ دوران سفر اکتا جاتی، گھر کا خوشبو دار سالن اور چپاتی اس سے بہت بہتر لگتی۔ کبھی مٹر پلاؤ یاد آتا تو کبھی شامی کباب، جس دن اسے واپس آنا ہوتا تو ملازمہ کو انہی میں سے کوئی فرمائش کر دیتی۔

گھر واپس آ کر ڈیڑھ دن سونا اس کی ضرورت ہوتی۔ وہ ایک دم نارمل تو نہیں ہو سکتی تھی۔ ڈیوٹی کے دوران تو سونے جاگنے کے اوقات پرواز پر منحصر ہوتے۔ اکثر رات ہوٹل میں گزارنی ہوتی۔ بہترین ہوٹل کے نرم بستر پر لیٹتے ہی اسے گھر کا نسبتاً سخت بستر یاد آ جاتا۔ ثانیہ اور مزمل کی صورت دل میں اتر جاتی۔ دل چاہتا فون کر لوں لیکن اکثر اس وقت ملک میں رات ہوتی۔ پھر ڈیوٹی کی مصروفیات کے دوران وہ سب کچھ بھول جاتی۔ اسے یاد رہتا تو اتنا کہ اسے اپنے لئے اپنے گھر کے لئے اور اپنے بچوں کے لئے سخت محنت کرنی ہے اور اسے یہ اندازہ بھی بخوبی تھا کہ دورانیہ بہت طویل ہے۔ آج وہ پورے ایک ہفتے کے بعد اپنے ملک واپس آئی تھی۔ امریکہ یا اسی طرح کے کسی دور دراز ملک سے آتے آتے اتنا وقت تو لگ ہی جاتا تھا۔

ملازمہ نے مٹر پلاؤ اور شامی کباب تیار کر لیے تھے۔ مگر بے حد تھکاوٹ اور نیند نے اسے اس فرمائشی کھانے کی طرف بھی راغب نہ ہونے دیا۔ وہ بستر پر گر گئی ایک ایسے مزدور کی طرح جس نے دن بھر اینٹیں ڈھوئی ہوں۔

دوسرے دن اس کی آنکھ جب کھلی تو دن کے گیارہ بج رہے تھے۔ بلال ثانیہ اور مزمل آفس اور اسکول کے لئے جا چکے تھے۔ ملازمہ اپنی معمول کی ذمہ داریوں میں مگن تھی۔

''میرے لئے پراٹھا اور چائے لے آؤ'' اس نے قدرے بلند آواز میں ملازمہ کو ہدایت دی۔

''اچھا باجی ابھی لائی'' شازیہ تھوڑی دیر کے بعد وہیں لاؤنج میں ایک ٹرے میں ناشتہ لے آئی۔ اسے بھرپور احساس ہوا کہ گھر ہی ایک ایسی جگہ ہے جہاں پر فرمائش کی جاسکتی ہے۔

اسی دوران شازیہ نے رانیہ کو آگاہ کیا'' باجی تانیہ بی بی کے یونیفارم چھوٹے ہو گئے ہیں، مزمل کا جوتا آگے سے پھٹ گیا ہے۔ لنچ باکس کھو گیا ہے، موزے کی بس دو جوڑی رہ گئی ہے۔ ایک دھوتی ہوں تو ایک پہنتے ہیں، جانے کہاں کھو دیتے ہیں مزمل بابو..... باورچی خانے میں روزمرہ کی پلیٹیں ٹوٹ ٹوٹ کر بہت کم رہ گئی ہیں۔ کوڑے کا ڈبہ پھٹ گیا ہے اور اس میں لگانے والی تھیلیاں بھی نہیں ہیں۔ کچھ بھی پکاؤں بچے ٹھیک سے نہیں کھاتے۔ باجی آپ جو پیسے انہیں دیتی ہیں ان سے باہر سے کھانے پینے کی چیزیں منگواتے ہیں پھر کھانا ضائع جاتا ہے۔''

اس نے ضروریات کی ایک لمبی فہرست سے رانیہ کو آگاہ کیا۔

''تم نے بلال کو بتایا ہوتا۔'' اس کے ذہن پر یہ ساری باتیں بوجھ بن رہی تھیں۔ اس نے شکایتی انداز میں جواب دیا۔

''کہا تھا۔'' شازیہ بولی۔

اسے ناگوار گزرا کہ بلال کو یہ سب معلوم ہے اور پھر بھی کوئی درد سری لینے کو تیار نہیں، اتنی مزے کی نوکری کے بعد وقت ہی وقت ہوتا ہے۔

''باجی وہ کہہ رہے تھے کہ باجی کو آنے دو وہ خود لائیں گی، میری لائی ہوئی کوئی چیز انہیں پسند نہیں آتی۔'' وہ آنکھیں جلدی جلدی جھپک کر بولی۔

بچے شام کو ماں کے ساتھ لگ کر بیٹھے تھے اور مامتا کی محبت بھری حرارت سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ بلال کو ویسے بھی بچوں کو لپٹانے چمٹانے کی عادت نہ تھی اسے کیا معلوم کہ یہ بچوں کی سب سے اہم ضرورت ہوتی ہے، انہیں اپنے قریب لایا جائے انہیں پیار کیا جائے۔

''کیسی ہو تم'' بلال نے اخبار کھولتے ہوئے پوچھا۔

''ویسی ہی'' جواب ملا۔

''شازیہ کئی دن سے گھر کے سامان اور بچوں کی چیزوں کے لئے کہہ رہی ہے کب چلو گی؟''

''مجھے کل شام پھر نکلنا ہے۔ آج کچھ آرام ملے گا تو کل کام کرنے کے قابل ہو سکوں گی۔ میں آپ کو بتا دیتی ہوں بلکہ شازیہ تم سمجھ لو اور ساتھ چلی جاؤ'' رانیہ نے شازیہ کو اپنے پاس بلاتے ہوئے کہا۔

''جی باجی'' وہ مستعد نظر آرہی تھی۔

''دیکھو جو چیزیں کل تم مجھے بتا رہی تھیں وہ سب لکھ لو اور بچوں کو بھی ساتھ لے جاؤ، سب سامان دیکھ بھال کر لینا خاص طور پر بچوں کے یونیفارم اور جوتے پہنا کر دیکھ لینا۔''

اب وہ سب بازار جا چکے تھے۔ موقع غنیمت پا کر اس نے اپنی الماری کی دیکھ بھال کرنی شروع کر دی تو کپڑوں کے ایک انبار کا سامنا کرنا پڑا۔ اچھا خاصا وقت لگ گیا۔ بلال اور بچے بھی آگئے۔ سامان سے لدے پھندے تھے۔

''شازیہ کھانا لگا دو جلدی سے'' رانیہ بری طرح تھک چکی تھی۔

''باجی سب نے کھانا باہر کھا لیا ہے۔ آپ کے لئے میز لگا دوں یا آپ کو یہیں لاؤنج میں لا دوں؟''

''ٹرے میں یہیں لا دو'' رانیہ کچھ دل برداشتہ تو ہوئی لیکن اسے یاد رہا کہ وہ اور اس کے گھر والے علیحدہ ہی کھاتے ہیں، کوئی نئی بات نہیں۔

دوسرے دن اس کی فلائٹ قطر کی تھی۔ اور اب ایک رات کے بعد گھر واپسی ہو رہی تھی۔ وہ ائیر لائن کی گاڑی میں ہی آتی جاتی تھی۔ آج ایک سٹیورڈ کی اپنی گاڑی آئی تھی، وہ اسکے محلے میں ہی رہتا تھا۔ اس نے بات کی وہ بھی جلدی ہی جانا چاہتی تھی۔

گھر کے باہر اتر کر دروازے کی گھنٹی بجائی تو مزمل کھولنے آیا۔ بے حد تھکاوٹ نے رانیہ کو نڈھال کر رکھا تھا۔ مزمل کو لپٹا کر پیار کیا۔ ثانیہ سو چکی تھی۔ اس نے آہستگی سے اپنا سفری بیگ لاؤنج میں رکھا اور اپنے کمرے کی طرف بڑھی مگر کچھ دیکھ کر ٹھٹھک گئی۔ لابی میں لگے قد آدم شیشے کے زاویے میں اسے کمرے کا منظر دکھائی دے رہا تھا۔

شازیہ ایک ہی صوفے پر بیٹھی بلال کو سوپ پلا رہی تھی اور بلال کے ہاتھ اس کا وجود سمیٹے ہوئے تھے۔

ایسی خراب landing..... سب سے بری!

اس نے سوچا، پرس نکال کر سگریٹ سلگائی اور دونوں ہاتھوں سے سر تھامے لاؤنج میں ہی صوفے پر ڈھیر ہو گئی۔

☆.....☆.....☆

حمیرا بنتِ فرید

واپسی

اوسط گھرانے میں جنم لینے والی ارفع ایک عام سی لڑکی تھی۔تعلیم مکمل ہونے پر، ہرلڑکی کی طرح، مناسب رشتہ آنے پر اس کا رشتہ طے کر دیا گیا۔شادی ہوئی، بچے ہوئے اور بڑے ہونے پر اسکول جانے لگے۔ اپنے دکھ سکھ کے ساتھ ندیم کے ساتھ اس نے دھوپ چھاؤں کی کئی منزلیں طے کی تھیں۔زندگی یونہی اپنی ڈگر پر رواں دواں تھی کہ ایک بے سکونی کی لہر نے ارفع کو اپنے حصار میں لے لیا۔

دن رات بظاہر ہر روز جیسے ہی تھے لیکن ندیم کے مشکوک رویہ نے ارفع کو کئی دن سے بے چین کیا ہوا تھا۔فون پر بات کرتے کرتے وہ اکثر سرگوشیاں کرنے لگتا۔کبھی اٹھ کر کمرے سے باہر ٹہلنے لگتا یا چھت پر چلا جاتا۔اکثر رات کو اس کی آنکھ کھلتی تو ندیم کو بستر پر کروٹیں لیتا ہوا پاتی۔ ''یاالٰہی! یہ ماجرا کیا ہے؟'' وہ سوچتی۔

''ندیم!'' وہ اسے پکارنا چاہتی، اس کا مسئلہ پوچھنا چاہتی پر ایک انجانا سا خوف اسے ایسا کرنے سے روک دیتا۔شاید اس کے کان ایسا کوئی جواب سننا نہیں چاہتے تھے جو اس کے لئے اذیت کا باعث بنتا۔عورت ہونے کے ناطے اس کا پہلا شک یہی تھا کہ شاید اس کا شوہر کسی دوسری عورت کے چکر میں پڑ گیا ہے جو ایک بیوی کی حیثیت سے اس کے لئے نا قابل برداشت ہوتا۔کچھ پوچھنے کے بجائے ارفع نے اپنے طور پر ہی تحقیقات شروع کر دی تھیں۔بظاہر کوئی کاروباری مسئلہ تو نہیں لگتا تھا کیونکہ ندیم عام دنوں سے زیادہ شاپنگ کروا رہا تھا۔بچوں کے لئے نئے کپڑے اور قیمتی کھلونے وہ اکثر لے کر آ رہا تھا۔ابھی کچھ دن پہلے ہی اس کے کہے بغیر اس کے لئے دو نئے جوڑے لایا تھا جس کو دیکھ کر اس کا دل ہر بار خوشی سے کھل اٹھنے کے بجائے، ڈوبنے سا لگا تھا۔ شاید اپنی ''محبوبہ'' کو تحائف دلاتے ہوئے، اپنی بے وفائی کی عیب پر پردہ ڈالتے ہوئے یہ کپڑے خرید لایا تھا۔ارفع نے خاموشی سے ندیم کے موبائل پر میسجز چیک کرنے شروع کئے جن کو پڑھ کر اسے خاصی مایوسی ہوئی۔کالز چیک کیں۔وہاں اسے ایک نمبر مشکوک نظر آیا جس پر اکثر کالز آتی جاتی رہی تھیں۔پر اسے کسی نام سے سیو (save) نہیں کیا گیا تھا۔

اس دن ندیم جلدی میں نکلتے ہوئے گھر پر ہی موبائل بھول گیا۔ اس ہی نامعلوم نمبر سے کال آ رہی تھی۔ارفع پہلے تو ٹھٹکی پھر کانپتے ہاتھوں سے کال ریسیو کی۔اس کے کچھ بولنے سے پہلے ہی ایک مردانہ آواز آئی۔ ایک لمحے کے لئے تو ارفع کو مردانہ آواز سن کر طمانیت محسوس ہوئی کیونکہ وہ تو نسوانی آواز کی منتظر تھی۔اگلے لمحے جو کچھ اس کے کانوں نے سنا وہ اس کے اوسان خطا کرنے کے لئے کافی تھا۔

''ہیلو سر! سارا سامان بالکل تیار ہے۔پیک کر دیا گیا ہے۔سخت چیکنگ کی وجہ سے رات تک تاخیر کرنا مناسب نہیں آپ آ کر ''اوکے'' کر دیں تو اس کو دن ہی میں روانہ کر دیں گے۔''

چند سیکنڈ خاموشی کے بعد یہاں سے کچھ جواب گئے بغیر فون بند کر دیا گیا۔ندیم اکثر کچھ بات کئے بغیر یونہی فون بند کر دیتا تھا۔کال کرنے والا شاید یہی سمجھا تھا کہ اس کے آس پاس کوئی ہے تبھی جواب موصول نہیں ہوا۔ارفع بت بنی کھڑی تھی کہ دروازے کی گھنٹی سے چونکی۔ اس نے موبائل اس کی جگہ پر رکھا۔ندیم موبائل کی غیر موجودگی کا احساس ہونے پر واپس لوٹا تھا۔

اس کے جانے کے بعد وہ سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔

''یااللہ! ندیم آخر کن چکروں میں پڑ گئے ہیں؟'' ارفع جتنا سوچتی اتنا ہی الجھن کا شکار ہوتی جاتی۔''

آخر ندیم کے ایک قریبی دوست اور ان کی بیگم کو اعتماد میں لے کر اس نے معلومات کروائیں۔ ندیم اسمگلنگ جیسے گھناؤنے کاروبار میں ملوث ہو چکا تھا۔ ارفع کے پیروں تلے زمین نکل گئی۔ دودھ کے بند ڈبوں کے ساتھ ہیروئن کی تھیلیاں چھپا کر دوسرے شہروں کو سپلائی کی جا رہی تھیں۔ ندیم آخر کیسے اور کیوں ان غیر قانونی حرکتوں میں ملوث ہو گیا تھا۔ اللہ کا دیا بہت کچھ تھا ان کے پاس۔ زیادہ کی خواہش تھی نہ ہوس۔ ہمیشہ چین کی نیند سوتے تھے پر اب سکون ان کی زندگی سے دور جا چکا تھا۔

''ندیم..... آجکل آپ بہت الجھے الجھے رہتے ہیں۔ کوئی مسئلہ ہے تو مجھے بتائیں نا۔ شائد میں آپ کو کوئی مشورہ دے سکوں۔'' ارفع نے اپنے طور پر سمجھانے کے لئے بات شروع کی۔

''نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں۔'' ندیم نے جواب دیا۔

''میں آپ کی بیوی ہوں۔ آپ ضرور مجھ سے کچھ چھپا رہے ہیں۔ کیا کاروبار کا کوئی مسئلہ ہے؟''

''تم کیا آدھی رات کو فضول باتیں لے کر بیٹھ گئی ہو۔ کوئی مسئلہ وسئلہ نہیں ہے۔'' ندیم نے بیزاری سے کہا۔

''آپ لاکھ چھپائیں لیکن میں جانتی ہوں۔'' ارفع نے لفظ ''جانتی'' پر زور دیتے ہوئے کہا۔

''کیا جانتی ہو؟'' ندیم بگڑ کر بولا۔ ''تم عورتوں کو بات کا بتنگڑ ہی بنانا آتا ہے۔''

''ندیم..... آپ جو کچھ کر رہے ہیں وہ درست نہیں۔ آپ کیوں سیدھے راستے سے بھٹک رہے ہیں۔'' ارفع کے لہجے میں اب درشتی تھی۔ ندیم نے ارفع کے لہجے کی سنجیدگی کا اندازہ لگا لیا تھا کہ اسے سچائی کا علم ہو چکا ہے۔ اب اس سے کچھ چھپانا فضول ہے۔

''ارفع..... میں کچھ غلط نہیں کر رہا۔ دنیا میں آگے بڑھنے کے لئے دنیا کے ساتھ قدم چلا کر چلنا پڑتا ہے۔ کاروبار میں تھوڑی بہت ہیرا پھیری تو چلتی ہے۔''

''تھوڑی بہت!!'' ارفع نے تلخ لہجے میں کہا۔ ''کیا چٹکی بھر زہر کھانے میں ملانے سے پورا کھانا زہریلا نہیں ہو جاتا؟ آپ کا یہ کاروبار ہمیں کہیں کا نہ چھوڑے گا۔ دنیا میں تو بے عزت ہوں گے ہی..... آخرت میں اللہ کو کیا جواب دیں گے؟''

''ارفع..... تم جذباتی ہو رہی ہو۔ کاروبار میں ایسا بہت کچھ ہوتا رہتا ہے۔''

''نہیں ندیم..... یہ معمولی بات نہیں ہے۔ خدا کے واسطے ہوش کے ناخن لیں'' ارفع نے منت کی۔ ''میں آپ کے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں۔ توبہ کر لیں۔ خود کو اپنے بچوں کو ہلاکت میں نہ ڈالیں۔'' ارفع نے روتے ہوئے واقعی اس کے آگے ہاتھ جوڑ دیئے۔

''تم ایک انتہائی بے وقوف عورت ہو۔ دنیا کتنی آگے بڑھ رہی ہے پر تم جیسی دقیانوسی سوچ کی عورتیں بھی سسک سسک کر زندگی گزارتی ہیں اور اپنے بچوں کو بھی کوئی روشن مستقبل نہیں دے سکتیں۔'' ندیم نے غصے سے دانت بھینچتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے..... آپ سوچ لیں۔ آپ نے عزت سے کمانا ہے تو ٹھیک ہے میں زندگی بھر آپ کا ساتھ دوں گی لیکن حرام کے لقمہ سے اولاد کی پرورش ہرگز نہیں کروں گی۔ میں ان کو جہنم کی آگ میں نہیں جھونگ سکتی۔'' ارفع نے حتمی طور پر ندیم کو آخری دھمکی بھی دے ڈالی۔ ''میں اپنے بچوں کو لے کر یہاں سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے چلی جاؤں گی۔''

دولت کے نشے نے ندیم کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی تھی۔ ارفع کے آنسو، اس کی ملتجی نظریں، معصوم بچوں کے افسردہ چہرے کچھ بھی اس کا دل موم نہ کر سکے۔ ارفع ایک کمزور عورت ضرور تھی لیکن اس کا ایمان بہت مضبوط تھا۔ ندیم محبت کرنے والا شوہر اور بچوں پر جان چھڑکنے والا باپ تھا۔ بچوں کو باپ سے جدا کرنا کوئی آسان کام نہ تھا لیکن حرام مال سے ان کی پرورش بھی اس کو گوارا نہ تھی۔ اسے اپنے اللہ پر کامل یقین تھا کہ جس نے انہیں پیدا کیا ہے وہ ہی اس کی اولاد کے لئے حلال رزق مہیا کرے گا۔ پھر ایک دن وہ خاموشی سے اپنے بچوں کو لے کر میکے آ گئی۔

میکے آنے کے کئی دنوں تک ہر گھنٹی پر وہ چونک جاتی کہ شاید ندیم لوٹ آئے ہوں لیکن ہر بار اسے مایوسی ہوتی ندیم نے کچھ دن انتظار کے بعد اسے واپس بلانے کی کوشش کی لیکن اس کا جواب ایک ہی تھا کہ وہ اس

گھناؤنے کاروبار سے جان چھڑالے تو وہ دل و جان سے اس کے ساتھ کی منتظر ہے۔ کئی ایک بار ندیم نے چیک بھجوایا جسے ارفع نے وصول کرنے سے انکار کر دیا۔ اسکول میں ٹیچر کی باعزت ملازمت کر کے وہ اپنا اور اپنے بچوں کا پیٹ پال رہی تھی۔

دیکھتے ہی دیکھتے دو سال گذر گئے۔ ارفع نے یہ عرصہ اپنے رب سے کتنی دعائیں اور التجائیں کرتے گزارا تھا، یہ وہی جانتی تھی۔ اس رات بھی جانے کتنی دیر تک جائے نماز بچھائے اللہ سے رو رو کر ندیم کی نیک ہدایت کی دعائیں مانگی تھیں۔ اس کی آنکھ لگے ابھی زیادہ دیر نہ ہوئی تھی کہ موبائل کی بیل سے اس کی آنکھ کھل گئی۔ اسکرین پر ندیم کا نام جگمگا رہا تھا۔ اس نے کال اٹھائی۔ کچھ دیر سکوت رہا پھر ندیم کی بھرائی ہوئی آواز آئی۔

''ارفع! میں بہت شرمندہ ہوں۔ تم سے اور بچوں سے دور رہ کر مجھے اندازہ ہوا ہے کہ سچے رشتوں کی محبت کے آگے دولت کوئی شے نہیں۔ میں نے اپنے اللہ سے توبہ کی ہے۔ اپنے گناہوں کی بہت معافی مانگی ہے۔ تم بھی مجھے معاف کر دو۔ تم نے اگر مجھے معاف کر دیا تو میرا رب بھی مجھ سے راضی ہو جائے گا۔ بولو معاف کر دیا نا۔''

ارفع کو اپنے کانوں پر یقین نہ آیا۔ اللہ نے اس کی سن لی تھی۔ ندیم کو آخر کار اپنی غلطی کا احساس ہو گیا تھا۔ اس نے سچی توبہ کر لی تھی۔ جب اللہ اپنے بندوں کے بڑے بڑے گناہ معاف کر کے ان کی توبہ قبول کر لیتا ہے تو وہ تو اس کی ایک حقیر بندی تھی۔

''آپ مجھے اور بچوں کو کب لینے آ رہے ہیں۔ میں آپ کی منتظر رہوں گی۔'' ارفع نے آنسوؤں کو ضبط کرتے ہوئے کہا اور کال کاٹ دی۔

دوسرے دن کا سورج ارفع کے لئے کچھ اور ہی پیغام لایا تھا۔ وہ خوشی خوشی تمام کام انجام دے رہی تھی۔ اس نے اپنا اور اپنے بچوں کا سامان پیک کرنا شروع کر دیا تھا۔ ندیم کسی بھی وقت ان کو لینے آنے والا تھا۔

دروازے پر دستک ہوئی۔ اس نے دوڑ کر دروازہ کھولا۔ سامنے وردی میں ملبوس آدمی نے پوچھا:

''آپ مسز ندیم ہیں؟''

''جی فرمایئے؟''

''مسز ندیم! رات فیکٹری پر چھاپہ پڑا تھا۔ معلوم ہوا تھا کہ وہاں غیر قانونی سرگرمیاں جاری ہیں۔ کچھ ملزمان نے فرار ہونے کی کوشش کی۔ اچانک پولیس کو فائرنگ کرنی پڑی۔ ہمیں افسوس ہے کہ ندیم صاحب بھی اس کی زد میں آ کر جاں بحق ہو گئے۔ آپ ڈیڈ باڈی وصول کر لیجئے۔''

ارفع نے سفید پڑتے چہرے کے ساتھ پیچھے دیکھا۔ وہاں سفید چادر میں لپٹی ندیم کی لاش تھی۔

ندیم ہمیشہ ہمیشہ کے لئے واپس آ چکا تھا.....اس گناہ بھری زندگی میں کبھی نہ لوٹنے کے لئے!!

☆.....☆.....☆

میری ایٹی نائن

۲۷ فروری ۲۰۱۶ء کی بات ہے، مومنہ کو ڈاکٹر کے پاس لے کر گئی۔ دن کے گیارہ ساڑھے گیارہ کا وقت ہوگا۔ ڈاکٹر نے الٹراساؤنڈ کیا۔ ایک ہومیو پیتھک پڑیا کھانے کو دی اور کہا کہ آپ اسے گھر لے جائیں اور سامان کی ٹوکری تیار کرلیں، انشاء اللہ آج ہی مومنہ فارغ ہوجائے گی۔ جب دس دس منٹ کے وقفہ سے پین ہونے لگے تو آجائیں۔

دونوں ماں بیٹیاں گھر واپس آگئیں۔ مومنہ کو ناشتہ دیا۔ دو نفل پڑھ کے سورہ مریم کی تلاوت کی، اسے بھی تاکید کی۔ کچھ اشاروں کنایوں میں خبردار کیا کہ ''جنت ایسے ہی قدموں تلے نہیں آجاتی۔''

ڈاکٹر صائمہ (اللہ اسے خوش رکھے) کی دی ڈیڈ لائن گذر گئی تھی مگر حالات ویسے نہیں تھے جیسے ہونا چاہئیں۔ فون پر مسلسل رابطہ رکھا۔ بالآخر اللہ کا نام لے کر نماز عصر کے بعد مومنہ کے نرسوں نے ڈرپ لگا دی۔

شروع میں کام ہلکا پھلکا ہی رہا پھر میری عزیز دوست خالدہ نے پیغام بھیجا کہ حضرت فاطمۃ الزہرہؓ کو ان حالات میں آپؐ نے سورہ الناس، سورہ فتح اور سورہ الاعراف کی ۵۳، ۵۴ آیات بتائی تھیں (یاد کیا تھا) بہرحال میں نے یہی آیات اور سورتیں پڑھ کے دم کیا۔ اللہ نے کام آسان کردیا۔ مگر وہ تین گھنٹے نہیں بلامبالغہ تین صدیاں تھیں۔ وقت رک گیا تھا اور دونوں طرف ممتا کا امتحان تھا۔ ایک ماں بننے کے تخلیق کے مرحلہ سے گذر رہی تھی اور دوسری اپنی بیٹی کو اس تکلیف میں دیکھ کر سراپا درد والم بن چکی تھی۔ مومنہ لیبر روم میں تھی جب مجھے لگا کہ ماں بننے سے بھی مشکل مرحلہ نانی بننے کا ہے۔

خدا نے کرم کیا، لیبر روم کا دروازہ کھلا۔ اللہ نے رحمتوں کا در کھول دیا تھا۔ ساڑھے تین کے جی کی بچی پیدا ہوئی۔ اس کی آواز سن کر احساس تشکر کے ساتھ تفکر بھی تھا کہ مومنہ کی حالت ابھی ایسی نہیں تھی کہ باہر لایا جاتا۔

تاہم گھر والوں کو اطلاع ہوچکی تھی۔ بارے خدا خدا کر کے ماں اور بچی کمرے میں شفٹ ہوئیں۔ قاصرہ، شکیلہ، بھابھی، باجی فرحت، عذرا سمیت بہت سے لوگ مبارکباد کے لئے موجود تھے۔ ''گڑھتی'' دینے کے لئے خالدہ بھی موجود تھیں رب نے ایک نئے رشتے سے نوازا بلکہ معتبر کردیا تھا۔

ذہن میں دھماکہ سا ہوا کن لفظوں میں اطلاع دی جائے؟ رومن میں ہی ''الحمدللہ اللہ نے 89 عطا کی ہے'' لکھ کر باجی کو سینڈ کردیا۔ وہی میسج بعد ازاں رات گئے سب کو بھجوایا۔ مبارکباد کے فون کی طویل سیریز شروع ہوگئی۔ ایک فون آتا ''مبارک ہو نانی بن گئی ہو۔'' دوسرا فون آتا'' یہ کیا لکھ بھیجا ہے سمجھ میں نہیں آرہا۔'' سمجھ میں آنے کے لئے اردو کی گنتی ایک دو سے اٹھاسی تک لے آؤ آگے خود ہی جواب مل جائے گا! میں نے جواب دیا۔

خیر، بچے خوب خوش تھے۔ بچی کو گود میں لے کر کمبل میں لپیٹ رہی تھی کہ ذروہ بولی۔ ''اُف نانی جان کیسے سخت ہاتھ لگا رہی ہیں۔''

''کیا.....نا.....نی.....؟'' لمحہ بھر کے لئے میں گنگ ہوئی۔

یعنی میں نانی بن گئی ہوں! خوشی اپنی جگہ پر مگر سچی بات ہے نانی دادی کے لفظ کے ساتھ ہی انشاء جی بہت یاد آئے۔ بھلا کیوں؟

انشاء جی اٹھو، اب کوچ کرو!

ظاہر ہے رشتوں میں رتبے بلند ہوئے.....واپسی کے سفر کی نوید لے کر، آنکھیں فوراً ہی نم ہوگئیں۔ ساتھ ہی کچھ محاورے کہاوتیں اشعار

یاد آ گئے۔بچپن آنکھوں میں سما گیا۔ مجھے یوں لگ جیسے سارے پنجابی اور اردو ادب پر نہ مامی نہ چاچی تائی ،بس نانی کا ہی قبضہ ہے۔سب سے پہلے تو وہی نظم جو ہر بچہ اپنے بچپن میں سنتا ہے۔

نانی اماں کہتی ہیں، چاند پہ پریاں رہتی ہیں۔

اس کا مطلب ہے نانی اماں بچوں کو تصوراتی دنیا (fantacies) میں لے جاتی ہیں!

پھر پنجاب کی ثقافت کا آئینہ دار ایک کھیل جو کوکلا چھپا کی سے ملتا جلتا تھا۔تمام بچے دائرے میں بیٹھے ہیں اور ایک بچے کو نانی اماں کا فرضی کردار دے کر پوچھا جاتا ہے۔

نانی اماں نانی اماں کھیل کو جائیں؟

اور نانی اماں مزے سے سر نفی میں ہلا کر کہتی ہیں

نہیں بچو.....

جب نانی اماں کا سر ہاں میں ہلتا ہے تو تمام بچے باقاعدہ کھیل کا آغاز کرتے ہیں۔

اس کا مطلب ہے نانی اماں کا کردار اتنا جاندار ہوتا ہے کہ ان کی اجازت کے بغیر کھیل بھی شروع نہیں ہوسکتا۔

پھر اردو محاورے نے انگڑائی لی۔نانی یاد آنا.....شدت کی تکلیف کا پیغام ''نانی یاد آنے' کا کہہ کر دیا جانا۔اس سے بھی مزے کی بات یہ ہوئی کہ جب رات گئے گھر پہنچے..... ''یہ'' بھی تھکے ہارے اندر داخل ہوئے بچے فوراً کہنے لگے۔

''نانا ابو آ گئے.....''

انہیں سمجھنے میں اسی طرح دیر لگی جیسے میرا میسج سمجھنے میں، کہ میری دوست کی بیٹی نے فون پر پوچھا۔

''آنٹی ،امی کہہ رہی ہیں ایٹی نائن والے میسج کا مطلب کیا ہے!''

اس کے فوراً بعد ایک خوشگوار چیخ کی آواز آئی۔''اوہ! نواسی.....مبارک ہو.....آپ نانی اماں بن گئیں!''

میں نے مبارک تو وصول کی لیکن قدرت کے اس حسین اور خوبصورت نظام پر ششدر تھی۔محض چند پونڈ کی ایک بچی کی آمد پر کتنے ہی لوگ نئے اور پیارے رشتوں میں بندھ گئے۔کوئی خالہ بنی تو کوئی ماموں کوئی چچا تو کوئی تایا، تائی ،والدین، ددھیال ننھیال، وہی ننھیال، جس کے بارے میں سیرت النبیؐ سے تعارف ملتا ہے۔نماز پڑھتے ہوئے حسنؓ اور حسینؓ کو گود میں اٹھا لینا۔رکوع وسجود کے وقت اتار دینا۔

پھر ایک اور واقعہ ذہن میں آ گیا۔موتیوں کا ایک خوبصورت ہار کہیں سے نبی اکرمؐ کو ملا، خیال تھا کہ سیدہ عائشہؓ کو دیا جائے گا یا پیاری بیٹی فاطمہؓ کے گلے کا ہار بنے گا۔مگر سب نے دیکھا وہ ہار آپؐ نے اپنی نواسی امامہؓ کو دیا۔عملاً اس رشتے سے محبت کا اظہار کر دیا۔

کہہ لینے میں کیا ہرج ہے، یہ رشتوں میں بہت پیارا رشتہ ہے!

سو میری پیاری عائشہ ماریہ! ہم سب کو اتنے معزز اور معتبر رشتوں سے نوازے جانے پر آپ کا شکریہ! اللہ آپ کو دائمی برکتوں کا باعث بنائے آمین۔

اصل زر سے سود پیارا ہوتا ہے۔یہ اپنی اولاد کی اولاد کو گود میں لے کر ہی پتہ چلتا ہے۔اللہ ان سب کو صاحب اولاد کرے جو اس رشتے کی لذت سے محروم ہیں آمین۔

☆.....☆.....☆

بھرم

گلابی جاڑوں کی ایک رات کوئی تین بجے کا عمل ہوگا کہ اچانک نواب صمصام الدولہ کی آنکھ کھل گئی۔ انہیں ڈرائنگ روم میں جو، ان کے کمرہ سے ملا ہوا تھا، کچھ کھڑکا سنائی دیا تھا۔ پہلے تو انہوں نے سوچا کہ تیز ہوا سے کوئی چیز گر پڑی ہوگی مگر پھر یاد آیا کہ ڈرائنگ روم کے سارے دروازے اور کھڑکیاں انہوں نے خود ہی تو بند کی تھیں۔ گھر میں کوئی پالتو جانور بلی یا کتا بھی نہ تھا جس سے گمان ہوتا کہ اس کے دوڑنے بھاگنے سے کوئی چیز گر پڑی ہوگی۔ چنانچہ وہ کچھ فکرمند ہو کر بستر سے اٹھ بیٹھے۔ شب خوابی کے لباس پر گاؤن پہنا پھر کمرے کے ایک کونے سے اپنی چاندی کی مٹھ والی چھڑی اٹھالی اور نواب بیگم کو جگائے بغیر، جو گہری نیند میں مدہوش ہلکے ہلکے خراٹے لے رہی تھیں، دبے پاؤں ڈرائنگ روم کی طرف چل دیئے۔

نواب صمصام الدولہ کی عمر کوئی پچاس پچپن برس کی ہوگی۔ تھے تو چھوٹے سے قد کے مگر ہاتھ پاؤں میں بڑا کس بل تھا، سرخ وسفید رنگت، بڑی بڑی روشن آنکھیں، بڑی بڑی مونچھیں، کتابی چہرہ جس سے شکوہ، بردباری اور علم ٹپکتا تھا۔

نواب صاحب ڈرائنگ روم کے دروازے کے قریب پہنچ کر ذرا رکے اور پردے کی اوٹ میں کھڑے ہو گئے۔ جب انہیں کوئی آہٹ سنائی نہیں دی اور نہ اندھیرے میں کوئی سایہ چلتا پھرتا دکھائی دیا تو انہوں نے کمرے میں داخل ہو کر بجلی کا بٹن دبا دیا۔ بجلی کی روشنی میں انہوں نے دیکھا کہ کمرہ تو خالی پڑا ہے البتہ ایک چھوٹی سی تپائی گری پڑی ہے اور اس پر پیتل کا جوخاکستردان رکھا تھا، وہ فرش پر اوندھا پڑا ہے۔ نواب صاحب کو یقین ہو گیا کہ بنگلے میں ضرور کوئی چور آ گھسا ہے۔ وہ بڑی دلیری کے ساتھ چور کی تلاش میں بنگلے کے ایک ایک کمرے کا جائزہ لینے لگے۔ اس بنگلے میں ڈرائنگ روم کے علاوہ چار بیڈروم تھے۔ ان میں سے ایک کو تو نواب صاحب اور نواب بیگم خود اپنے تصرف میں لاتے تھے اور باقی تین خالی پڑے تھے کیونکہ ان کا اکلوتا صاحب زادہ مدت ہوئی کاروبار کے سلسلے میں کسی دور دراز کے ملک میں جا کر وہیں کا ہو گیا تھا اور دونوں صاحب زادیاں شادی کے بعد اپنے اپنے شوہر کے گھر آباد ہو گئی تھیں۔ بنگلے میں اب فقط نواب صاحب اور نواب بیگم ہی رہتے تھے۔ کوئی مستقل ملازم بھی نہ تھا، بس ایک چھوکرا تھا جو دن بھر ادھر اُدھر کے کام کر کے شام کو اپنے گھر چلا جاتا تھا۔

نواب صاحب بڑی کفایت شعاری سے گزر بسر کرتے تھے، نہ موٹر تھی، نہ بگھی گھوڑا۔ پھر بھی ان کا شمار معززین میں ہوتا اور شہری تقریبات میں شمولیت کے لئے انہیں اکثر دعوت نامے آیا کرتے تھے۔ اس کی وجہ ان کی اعلیٰ نسبی، خاندانی وجاہت اور ذاتی شرافت تھی۔ انہیں فخر تھا کہ ان کا شجرہ نسب کئی واسطوں سے نادر شاہ افشار سے جا ملتا ہے۔ ان دنوں وہ کچھ چپ چپ سے زندگی گزار رہے تھے۔ ان کے مشاغل کیا تھے، اس کا کسی کو علم نہ تھا اور نہ کوئی ان کی آمدنی کا ٹھیک ٹھیک حال جانتا تھا۔

بعض کہتے تھے کہ ان کا صاحب زادہ دوسرے تیسرے مہینے ایک خطیر رقم انہیں بھیجتا رہتا ہے۔ طبعاً کم آمیز اور انتہائی پسند تھے، کسی سے ملنے جاتے اور نہ کوئی ان سے ملنے آتا۔ بس اپنے بنگلے کی چار دیواری میں وہ اپنے خاندانی ناموں کو سینے سے لگائے گوشہ نشینی کی زندگی بسر کیے جا رہے تھے۔

نواب صاحب نے تینوں بیڈروم ایک ایک کر کے دیکھ ڈالے مگر انہیں کوئی چور کہیں نظر نہ آیا۔ باورچی خانہ بھی خالی پڑا تھا۔ اب وہ توشہ خانے کے پاس پہنچے۔ اس کا دروازہ کھولنا چاہا تو اسے اندر سے بند پایا، انہیں یقین ہو گیا کہ چور اس کے اندر ہے۔ انہوں نے چھڑی سے دروازہ ٹھوک کر تحکمانہ لہجے میں کہا ''اندر کون ہے.....؟''

چند لمحے خاموشی رہی۔

انہوں نے دروازہ پھر ٹھوکا ''تم جو کوئی بھی ہو فوراً دروازہ کھول کر باہر آ جاؤ'' اندر سے اب بھی کوئی جواب نہ ملا۔ اس پر نواب صاحب نے

ذرا ڈانٹ کر کہا ''دیکھو اگر تم ایک منٹ کے اندر باہر نہ آئے تو میں باہر سے دروازہ بند کر کے پولیس کو خبر دوں گا۔''

اس پر اندر سے چٹخنی سرکنے کی آواز سنائی دی۔ نواب صاحب چھڑی تانے ہوئے تو تھے ہی پھر بھی احتیاطاً دروازے کے سامنے سے ہٹ گئے کہ کہیں چور باہر نکلتے ہی وار نہ کر دے مگر چور کے ہاتھ میں کوئی ہتھیار نہ تھا۔ وہ گردن جھکائے آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا تو شہ خانے سے باہر نکل آیا۔ وہ کوئی پچیس چھبیس برس کا دبلا پتلا نوجوان تھا۔ پتلون اور سویٹر پہنے، گلے کے گرد مفلر بڑے والہانہ انداز سے لپیٹے، انگریزی فیشن کے بال، جو گدی کے قریب گچھے دار ہو گئے تھے، باریک باریک مونچھیں، لمبی لمبی قلمیں۔

''میاں صاحبزادے! شکل سے تو تم چور نہیں لگتے، سچ سچ بتاؤ تم کون ہو اور یہاں کیوں آئے.....؟''

نواب صاحب کے نرم لہجے سے چور کی ڈھارس بندھی اور اس نے کہا ''بہتر ہے کہ آپ ڈرائنگ روم میں تشریف لے چلیے، میں وہیں عرض کروں گا۔''

چور نے یہ الفاظ ایسے مہذب اور پر اعتماد لہجے میں کہے کہ نواب صاحب کو مجبوراً کہنا پڑا ''اچھی بات ہے، تم آگے چلو''

ڈرائنگ روم میں پہنچ کر نواب صاحب نے تیز روشنی میں چور کا چہرہ غور سے دیکھا تو اس پر انہیں کسی قسم کی درشتی یا بدکرداری کے آثار نظر نہ آئے، نہ خوف یا گھبراہٹ کا نشان تھا۔ اس کی آنکھوں میں ذہانت کی چمک تھی اور ہونٹوں پر ایک خفیف سا تبسم، وہ بے تکلفی سے صوبے پر بیٹھ گیا اور کہنے لگا ''آپ بھی تشریف رکھیے تو یہ ناچیز اپنا تعارف کروائے۔''

نواب صاحب کچھ مبہوت سے ہو کر کرسی پر بیٹھ گئے۔

''خاکسار کو بشیر علی کہتے ہیں۔ اردو میں اچھی خاصی اور انگریزی میں معمولی شد بد رکھتا ہوں، افسوس کہ میں اپنی تعلیم جاری نہ رکھ سکا''

''میاں صاحبزادے!'' نواب صاحب نے اس کی بات کاٹ کر کہا ''یہ باتیں تو بعد میں ہوں گی پہلے یہ بتاؤ کہ تم یہاں آئے کس لئے ہو.....؟''

چور نے بڑی بے باکی سے کہا ''آیا تو میں چوری کی نیت ہی سے تھا مگر میں نے سخت دھوکا کھایا'' میں نے یہ بنگلہ دوسرے بنگلوں سے الگ تھلگ اور سنسان جگہ دیکھ کر چوری کے لئے تاکا تھا، پھر بنگلے پر آپ کے نام کا جو بورڈ لگا تھا، نواب صمصام الدین الدولہ تہور یار جنگ بہادر، اس نے بھی میرے لئے بڑی کشش پیدا کر دی تھی، پھر میں نے یہ بھی دیکھا کہ یہاں نہ تو کوئی چوکیدار ہے اور نہ کوئی نوکر چاکر، بس آپ اور آپ کی بیگم ہی رہتی ہیں، یہ بات بھی چوری کے لئے بڑی سازگار تھی، چنانچہ جب آدھی رات گزر گئی تو میں دل میں بڑی امیدیں لئے ہوئے دیوار پھاند کر آپ کے بنگلے میں داخل ہوا لیکن نواب صاحب! یقین جانیے یہاں قدم رکھنے کے دوسرے ہی لمحے مجھے اپنی حماقت اور انتہائی نا تجربہ کاری کا احساس ہو گیا۔''

''وہ کیونکر.....؟'' ''وہ یوں نواب صاحب! بے تکلفی معاف کہ یہ بنگلہ سراسر ایک فریب ہے، دھوکا ہے۔ اس بنگلے میں ایک بھی چیز تو ایسی نہیں جو چرانے کے قابل ہو۔ ذرا اس ڈرائنگ روم ہی پر نظر ڈالئے۔ یہ دقیانوسی صوفہ سیٹ ہے، یہ پرانا قالین جس میں جگہ جگہ سوراخ ہیں، یہ پرانی گول میز، یہ بے ڈھنگی تپائیاں جن کا روغن اتر چکا ہے، یہ دیوان پر میلا سا پلنگ پوش بچھا ہے۔ یہ پرانے مخملی گاؤ تکیے، یہ بوسیدہ پردے، بھلا کوئی چور انہیں چرانے کی حماقت کر سکتا ہے اور اگر کر بھی لے تو ان کو اٹھا کر کہاں لے جائے گا.....؟''

چوروں کو نواب صاحب! جس چیز سے دلچسپی ہوتی ہے وہ اول تو ہے نقدی، اس کے بعد جواہر اور زیور کی باری آتی ہے اور ان کے بعد نوادر، سونے چاندی کے ظروف، گھڑیاں خواہ جیسی بھی ہوں، پھر ریشمی پارچہ جات، بنارسی ساڑھیاں، قیمتی کپڑے کے عمدہ سلے ہوئے مردانہ سوٹ، آتشیں اسلحہ جیسے بندوق یا پستول یا پھر تفریح یا دل بہلاوے کی چیزیں ریڈیو یا ٹرانسسٹر، سلائی مشین بھی بری نہیں، گوذرا بھاری ہوتی ہے۔ آپ کے ہاں سے تو معاف کیجئے گا نواب صاحب! کوئی عمدہ قسم کا ایک قلم تک نہیں نکلا۔ مہربانی کر کے اپنے بنگلے کے دروازے سے اپنے نام کا بورڈ اتروا لیجئے یا پھر اپنا نام بدل لیجئے ورنہ مجھ جیسے نہ جانے کتنے احمق اور ناتجربے کار چور یہاں آ کر ناحق اپنا وقت ضائع کرتے رہیں گے۔ آپ کے تینوں بیڈروم بھی خالی پڑے ہیں۔ ان ٹوٹے پھوٹے نواڑی

پلنگوں کے سوا کچھ بھی نہیں ہے اور پھر خود آپ کے بیڈروم میں.....''

''کیا تم میری خواب گاہ میں بھی داخل ہوئے تھے.....؟''

نواب صاحب نے حیرانی سے پوچھا۔

''اجی داخل ہی نہیں ہوا، پورے دو گھنٹے آپ کی موانست میں گزارے ہیں۔اس دوران آپ برابر زور زور سے اور آپ کی بیگم صاحبہ ہلکے ہلکے خراٹے لیتی رہیں۔ جب سب طرف سے مایوس ہوکر میں آپ کے کمرے میں پہنچا اور میں نے تجوری دیکھی تو میری باچھیں کھل گئیں۔ مجھے یقین ہوگیا کہ میری محنت اکارت نہیں جائے گی، میں اس بنگلے سے خالی ہاتھ نہیں جاؤں گا، میں پورے دو گھنٹے کی جدوجہد کے بعد تجوری کھولنے میں کامیاب ہوگیا لیکن نواب صاحب! آپ میری مایوسی کا اندازہ نہیں کر سکتے جب اس تجوری سے چند کاغذات کے سوا میرے ہاتھ کچھ نہ لگا اور یہ کاغذات کیا تھے؟ ایک تو تھا آپ کا خاندانی شجرہ اور دوسرے تھے آپ کے اپنے اور صاحب زادیوں کے نکاح نامے، گھبرائیے نہیں نواب صاحب! میں نے احتیاط سے پھر انہیں تجوری میں بند کر دیا تھا۔اس کے بعد میں آپ کے کپڑوں کی الماری کی طرف متوجہ ہوا مگر اس میں بھی مجھے دو تین پرانی شیروانیوں اور بوسیدہ ساڑھیوں کے سوا جن کا رنگ اڑ چکا تھا، کچھ نظر نہ آیا میں نے آپ کی شیروانیوں کی سبھی جیبیں ٹٹول ڈالیں مگر قسم لے لیجئے جو کسی میں سے ایک چونی تک نکلی ہو۔ میں بہت تھک کر اور مایوس ہو کر آپکی خواب گاہ سے نکلا اور دوبارہ ڈرائنگ روم میں پہنچا کہ جانے سے پہلے ایک نظر اور ڈال لوں مگر میری بے احتیاطی بلکہ لاپرواہی نے مجھے تپائی سے ٹکرا دیا۔ کھڑکا سن کر آپ جاگ اٹھے اور مجھے تو شہ خانے میں پناہ لینی پڑی، تو نواب صاحب! یہ ہے میری کہانی''

نواب صمصام الدولہ بڑے غور سے چور کی باتیں سنتے رہے، جب وہ خاموش ہوا تو انہوں نے پوچھا ''کیا تمہیں یہ ڈر نہیں ہے کہ میں تمہیں پولیس کے حوالے کر دوں گا.....؟''

''ہرگز نہیں..... کیونکہ مجھے یقین ہے کہ آپ ایسی حماقت کبھی نہیں کریں گے۔ جب تک میں نے اس بنگلے کا جائزہ نہیں لیا تھا مجھے یہ ڈر ضرور تھا مگر اب مطلق نہیں، شاید آپ مجھے چھ ماہ یا سال بھر کی سزا دلوانے میں کامیاب ہو جائیں مگر اس کے ساتھ ہی آپ کی ثروت، خاندانی وجاہت اور نام و ناموس کا پول بھی تو سارے شہر پر کھل جائے گا کیونکہ پولیس کے افسر موقع واردات دیکھنے آئیں گے اور پھر اخباروں میں میرا بیان چھپے گا کہ افسوس صد افسوس مجھے خواہ مخواہ یہ ذلت اٹھانی پڑی کیونکہ نواب صمصام الدولہ تہور یار جنگ بہادر کے بنگلے میں ایک بھی چیز تو ایسی نظر نہ آئی جو چرانے کے قابل ہوتی۔ تو آپ اپنے جیسوں کو کیا منہ دکھانے کے قابل رہیں گے.....؟''

نواب صاحب سے اس کا کچھ جواب نہ بن پڑا۔ چند لمحے خاموشی رہی چونکہ رات زیادہ گزر چکی تھی اس لئے نواب صاحب نے یہ قضیہ نمٹانے کے لئے پوچھا '' اچھا تو میاں صاحبزادے! اب تم کیا چاہتے ہو.....؟''

''بس مجھے تھوڑی سی نقدی دلوا دیجئے یقین جانیے نواب صاحب! میں نے آج دن بھر کچھ نہیں کھایا۔''

نواب صاحب چند لمحے سوچتے رہے پھر بولے ''اچھا .....تم یہاں چپ چاپ بیٹھے رہو۔ میں کچھ انتظام کرتا ہوں۔''

یہ کہہ کر وہ اپنی خواب گاہ میں گئے نواب بیگم ابھی تک میٹھی نیند سو رہی تھیں۔نواب صاحب نے آہستہ سے ان کا شانہ پکڑ کر ہلایا ''نواب بیگم ذرا اٹھنا''

نواب بیگم ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھیں ''کیا ہے نواب صاحب!''

''مجھے کچھ روپے چاہئیں''

''روپے.....؟ بھلا میرے پاس کہاں سے آئے.....؟''

''وہ جو صبح میں نے تمہیں پانچ کا نوٹ دیا تھا، وہ کیا ہوا.....؟''

''ارے بھول گئی۔ وہ تو ہے، یہیں سرہانے کے نیچے۔''

''تو لاؤ جلدی سے نکال کر دو۔''

''کیا کرنا ہے اس نوٹ کا.....؟''

''بھئی ایک دوست کو دینا ہے۔ بے چارہ بڑی مصیبت میں گرفتار ہے، جبھی تو ایسے نا وقت میں میرے پاس آیا ہے۔ جلدی کرو نواب بیگم! میں نہیں چاہتا کہ بے چارہ مایوس ہو کر میرے بنگلے سے خالی ہاتھ چلا جائے۔'' ☆

مجھے گھر جانا ہے

میرے بچپن کے دوران اپنے خاندان کے ساتھ کچھ عرصہ میرا قیام کوئٹہ میں رہا۔ چھٹیوں کے دوران ہم اپنے رشتہ داروں سے ملنے کیلئے بذریعہ ریل پنجاب جایا کرتے تھے۔ اس زمانے میں کچھ راستہ طے کرنے کے بعد ہم سب کو ریل سے اتر کر ایک رات ریلوے اسٹیشن پر بسر کرنا پڑتی تھی کیونکہ لاہور جانے والی ٹرین دوسرے دن اس اسٹیشن پر آتی تھی۔

ریلوے اسٹیشن پر ایک بڑا سا کمرہ انتظار گاہ کے نام سے منسوب تھا۔ اس میں جا بجا لکڑی کے بنے ہوئے بینچ تھے۔ ہم بچوں کو سونے کے لئے ان بینچوں پر لٹا کر ہمیں چادریں اوڑھا دی جاتیں کہ جب ہمارے چاہنے والے ہمارے سر پرست ، ہمارے نگران ، ہمارے نگہبان ، ہمارے وفادار ، ہمارے ذمہ دار اور پہرے دار بیدار ہیں تو پھر بھلا ہم کیوں جاگیں۔ نیند ہمارے والدین سے کوسوں دور چلی جاتی۔ ان کی نظریں ہم پر ٹکی رہتیں اور ان کا دھیان منزل میں اٹک کر رہ جاتا۔ ہماری محبت اور منزل کی کشش انہیں سونے نہیں دیتی تھی۔

اس وقت بچپن کی ناسمجھی، سادگی، بھولپن اور معصومیت کی وجہ سے میں منزل کو یکسر فراموش کر دیتی اور ریلوے اسٹیشن کی پر رونق اور پر ہجوم دنیا میں کھو کر یہ بھول جاتی کہ میں کہاں سے آئی ہوں اور مجھے کہاں جانا ہے۔ وہاں بھانت بھانت کے لوگوں کی چلت پھرت مجھے متوجہ کر لیتی۔ کھانے پینے کے اسٹالوں سے انواع واقسام کے کھانوں کی اشتہا انگیز، مسحور کن خوشبو مجھے گھیر لیتی۔ جہاں بچوں کے لئے کھلونوں کے اسٹال تھے، جہاں کھلونوں کے ساتھ رنگین باتصویر دلچسپ کہانیوں کی کتابیں بھی دستیاب تھیں جہاں گھر کا صاف ستھرا، صحت افزا کھانا کھانا مجبوری نہیں، جہاں اسکول جانا مجبوری نہیں، جہاں رات کو وقت پر سو جانا مجبوری نہیں۔

اس بدنظمی اور بے قاعدگی کا جو انجام ہو، سو ہو..... مجھے تو کھیل تماشے کی یہی دنیا چاہئے۔

آج میں بچپن کو پیچھے چھوڑ کر بہت آگے بڑھ گئی ہوں۔ وقت کے ساتھ ساتھ میرے بالوں میں چاندی بکھر گئی ہے۔ اب کمزوری اور ضعف کا احساس ہونے لگا ہے۔ پہلے جیسی چستی نہیں رہتی گویا حلیہ بدل گیا ہے لیکن حالات نہیں بدلے۔ یعنی تجربات وحوادث کی بھٹی سے گزر کر بھی ابھی تک بچپن کی وہی ناسمجھی اور حماقت برقرار ہے، اس کھیل تماشوں کی دنیا کے سحر نے کل کی طرح آج بھی مجھے اسیر کر رکھا ہے۔ میں اپنے گھر کا راستہ کھو چکی ہوں۔ میں بھول چکی ہوں کہ میرا بھی کوئی گھر ہے جہاں سے مجھے رخصت کیا گیا تھا اور جہاں مجھے لوٹ کر جانا ہے۔

میں گردوپیش سے بے نیاز انہی سوچوں میں گم تھی کہ اگلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے ایک آدمی نے پیچھے مڑ کر مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ چونکہ میرے برابر والی سیٹ خالی ہے اس لئے اگر میں اس کی بیٹی کو چند گھنٹوں کیلئے اپنے ساتھ بٹھا لوں تو وہ اپنی تینوں سیٹوں پر آرام سے سو جائے گا۔ اس کی بیٹی کی عمر سترہ اٹھارہ برس کے لگ بھگ تھی۔ وہ جدید قسم کا لباس زیب تن کئے ہوئے تھی اور چال ڈھال کا پر اعتماد انداز کچھ ایسا تھا جیسے زمانے کو ٹھوکر کی زد پر رکھا ہو۔ حسبِ عادت اس کا حلیہ دیکھ کر میں نے فوراً اس کی سوچ اور شخصیت کے بارے میں سوچا اور اس نتیجے پر پہنچی کہ شاید ہم دونوں کو ایک دوسرے کی صحبت راس نہیں آئے گی۔ ایک تو عمر کا فرق، پھر حلیوں کا فرق.....اور شاید سوچ کا بھی فرق۔ اور جہاں اتنے تضادات ہوں وہاں بات کیا بنے۔

میں نے دیکھا نہیں، محسوس کیا ہے تجھ کو
تیری انداز سے تصویر بنا سکتا ہوں

بہر حال نہ چاہتے ہوئے بھی میں نے اسے اپنے پاس بلالیا اور وہ میرے برابر آ کر بیٹھ گئی۔ سیٹ پر بیٹھتے ہی اس نے اپنا لیپ ٹاپ کھول لیا اور مصروف ہوگئی۔ جہاز کی کھڑکیوں کو پلاسٹک کے کورز سے ڈھانپ دیا گیا اور جہاز میں نیم تاریکی چھا گئی۔ کچھ مسافر اونگھنے لگے، کچھ سیٹوں پر بیٹھے بیٹھے سو گئے، جن کو جگہ مل گئی، وہ لیٹ گئے۔ میں نے اپنے بیگ میں سے کتاب نکالی اور اسے پڑھنا شروع کر دیا۔

دو تین گھنٹے گزر جانے کے بعد جب ہم دونوں اپنی اپنی مصروفیات کی یکسانیت سے اکتانے لگے تو ایک دوسرے سے ہم کلام ہو گئے۔ اس نے بتایا کہ ابھی وہ چند ماہ کی تھی، جب اس کے والدین اسے لے کر کینیڈا چلے گئے۔ اس نے وہیں ہوش سنبھالا اور ابتدائی تعلیم وہاں سے ہی حاصل کی۔ پھر اچانک اس کے والدین کو خیال آیا کہ بیٹی کو او لیول اور اے لیول پاکستان میں رہ کر وہاں سے کروایا جائے تا کہ وہ اپنے ملک کی تہذیب و ثقافت سے آشنا ہو سکے۔ چنانچہ وہ اسے لے کر پاکستان آ گئے وہاں رہ کر اس نے او لیول کا امتحان پاس کر لیا اور اے لیول کا امتحان دے کر فارغ ہوئی تو والدین اسے کچھ عرصہ کیلئے کینیڈا سیر و تفریح کیلئے لے کر جا رہے تھے۔ وہ بہن بھائیوں میں سب سے چھوٹی تھی۔ باقی سب بہن بھائی کینیڈا میں ہی تھے۔ وہ خوش تھی کہ اتنے عرصے کے بعد ان سے ملنے جا رہی تھی۔ اسے کینیڈا کی نسبت پاکستان میں رہنا زیادہ پسند آیا تھا کیونکہ یہاں انسان انسانوں سے جڑے ہوئے تھے۔ رشتہ داروں کے مابین محبتوں کے تعلق قائم تھے دوستوں میں بھی خلوص تھا جبکہ وہاں یہ سب کچھ عنقا ہو چکا تھا۔ پھر یہاں زندگی میں سکون اور ٹھہراؤ تھا لیکن وہاں انسان وقت کے ساتھ مشینی دوڑ میں مصروف تھے۔ میں نے اس کے پسندیدہ مضمون کے بارے میں پوچھا تو کہنے لگی۔

''آنٹی! میرا پسندیدہ مضمون اسلامیات ہے۔ مجھے اس مضمون میں اے سٹار ملا ہے۔''

پھر رمضان کا تذکرہ شروع ہوا تو کہنے لگی۔

''میں نے سارے روزے رکھے ہیں۔ بلکہ اپنی امی کے ساتھ رات کو تراویح پڑھنے کیلئے مسجد بھی جاتی رہی ہوں۔'' اور یہ کہ ''لوگ اسلام کو صرف عبادت تک محدود سمجھتے ہیں حالانکہ میری امی کہتی ہیں کہ عاجزی اختیار کرنا، دوسروں کی مدد کرنا، لوگوں کے ساتھ اچھے اخلاق سے پیش آنا، ایمانداری کے ساتھ اپنے فرائض ادا کرنا اور ہر حال میں صرف اللہ پر بھروسہ رکھنا اصل ایمان ہے۔ آنٹی میری امی کہتی ہیں کہ اللہ سے جڑ جاؤ اور پھر اس کے بندوں سے بھی جڑ جاؤ۔''

سارا راستہ گاہے بگاہے اس سے بات چیت ہوتی رہی۔ ہلکے پھلکے موضوعات زیر بحث آتے رہے۔ مجھے اس کی سادگی اور اس کی سوچ پر پیار آتا رہا اور میں دل ہی دل میں اسے دعا دیتی رہی، اور اپنی اس عادت پر حیران بھی ہوتی رہی کہ میں اکثر اجنبی لوگوں کو لمحہ بھر کیلئے دیکھتی ہوں اور پھر فوراً ان کی ذات اور شخصیت کے بارے میں مثبت یا منفی تاثر دل میں بٹھا لیتی ہوں۔ بارہا میرے یہ اندازے، تخمینے اور پیشین گوئیاں غلط ثابت ہو چکی ہیں، کیونکہ کسی کے باطن تک رسائی آسان نہیں کہ دلوں کے بھید تو وہی جانتا ہے کہ

دل دریا سمندروں ڈونگے کون دلاں دیاں جانے ہو!

ویسے بھی جب تک کوئی کلام نہ کرے، اس کے بارے میں کوئی رائے نہیں دی جا سکتی۔ اور پھر کسی کو جاننے کے لئے دل کی آنکھ کا وا ہونا ضروری ہے۔ اب میرے پاس دیدۂ بینا تو نہیں لیکن اندازے لگانے کا شوق ہنوز باقی ہے۔

ظاہر کی آنکھ سے نہ تماشہ کرے کوئی
ہو دیکھنا تو دیدۂ دل وا کرے کوئی

☆.....☆.....☆

صبیحہ نبوت

انڈیانا

امریکہ میں ریڈانڈینز کا دیس

''امی چلیں ہمیں تین گھنٹے پہلے پہنچنا ہے اور اب وقت کم ہے۔'' میرے بیٹے شعیب نے سوٹ کیس اٹھاتے ہوئے کہا۔

''ہاں بھئی مجھے پتہ ہے کیا یہ میرا کوئی پہلا سفر ہے!'' یہ کہتے ہوئے میں نے اپنا بیگ اٹھایا اور ہم سب گاڑی میں بیٹھ گئے۔

ہمارے گھر سے ائیر پورٹ کا فاصلہ آدھے گھنٹے کا تھا۔ رات کا وقت تھا سڑکیں سنسان تھیں۔اس لئے ہم وقت سے پہلے ہی ائیر پورٹ پہنچ گئے۔ٹرالی میں سامان رکھا بچوں کو پیار کیا، بیٹے اور بہو کو گلے لگا کر سب کو رخصت کیا اور باقی مراحل سے گذرتے ہوئے جہاز میں اپنی سیٹ سنبھالی۔ اب میری سوچیں امریکہ انڈیانہ کے گرد گھوم رہی تھیں کیونکہ اس دفعہ میری منزل امریکہ کی اڑتیسویں بڑی ریاست انڈیانہ تھی جس کا رقبہ ترانوے ہزار کلومیٹر کے قریب ہے اور آبادی چیاسٹھ لاکھ کے لگ بھگ، جس میں خواتین کی اکثریت ہے۔

انڈیانا نام کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ جب اٹھارویں صدی میں یورپ کی مختلف ریاستیں باہم دست وگریباں تھیں،تو ان میں سے برطانوی اور فرانسیسی باشندے اپنے علاقوں کو چھوڑ کر ان علاقوں میں آباد ہو گئے اور یہ علاقے برطانوی نوآبادی میں شمار ہونے لگے۔ان نئے آنے والوں نے مقامی ریڈانڈینز کو تتر بتر کر دیا تھا۔لیکن اس علاقے کا نام ان کے نام پر (Indiana) انڈیانا رکھ دیا گیا۔ کیونکہ ترقی یافتہ لوگوں کی پکی نشانیاں ہوتی ہیں کہ وہ اپنے ماضی کو یاد رکھتے ہیں۔

میری بیٹی اور داماد ماشاءاللہ سے اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں اور آجکل انڈیانا میں مقیم ہیں۔اس دفعہ میں آٹھ سال بعد جارہی تھی۔زیادہ مقصد نواسوں کی آمین میں شرکت کرنا تھی۔بچوں کے قرآن مجید دوسال پہلے ختم ہو گئے تھے اور آمین مجھے بلانے کے لئے بھی کی جارہی تھی بلکہ دھمکی دی گئی تھی کہ آپ آمین میں نہیں آئیں تو ہم بھی کبھی نہیں آئیں گے۔ بہرحال اللہ کا شکر ہے جس نے مجھے ہمت دے رکھی ہے کہ میں اکیلے بھی سفر کر سکتی ہوں۔

یہ ''اتحاد'' کی فلائٹ تھی، کافی آرام دہ، بااخلاق ائیر ہوسٹس اور اچھی سروس۔اتفاق سے ساتھی بھی اچھے مل گئے تھے کچھ دیر ہم نے ایک دوسرے سے تعارف میں وقت گزارا پھر میں نے آرام کی غرض سے آنکھیں موند لیں نیند تو نہ آئی لیکن خیالات ماضی کے تانے بانے بننے میں مصروف ہو گئے۔

طالب علمی کا زمانہ یاد آیا جب ہم سب سہیلیاں پڑھائی سے زیادہ تفریحات میں حصہ لیتی تھیں۔ہر فنکشن میں بڑی تیاری کے ساتھ جاتے۔کیا ڈرامے، کیا ڈی بیٹس، کیا مشاعرے اور کیا پارٹیاں یہاں تک کہ دست شناسوں کو ہاتھ دکھانا بھی ہماری تفریح میں شامل تھا۔اور ہر نجومی ہمیں بتاتا کہ تمہارے ہاتھ میں باہر کے سفر بہت ہیں۔ یہ سن کر خوشی تو ہوتی لیکن پھر اپنے مشرقی اور گھر والوں کے دقیانوسی ہونے کا تصور کرتے تو اوس پڑ جاتی، البتہ جب مستقبل کے خواب سجاتے تو شادی کے بعد یہ سب ممکن نظر آتا مگر جب شادی ہوئی تو ایک قابل لیکن روایتی پروفیسر سے جنہیں لکھنے پڑھنے کے علاوہ کچھ پتہ ہی نہیں تھا۔

پھر ہم نے بھی اپنے دل کو سمجھا لیا بلکہ اسی ماحول میں ڈھال لیا۔ نجومی اور ان کی قیاس آرائیاں گمراہ کن لگنے لگیں۔ پھر گھر اور گھرداری میں زندگی ایسی الجھی کہ ماضی دماغ سے بالکل نکل گیا بچے بڑے ہو گئے سب کی تعلیم اختتام کو پہنچی بڑے بیٹے نے بوسنیا میں قیام کیا اور بیٹی کی شادی امریکہ میں ہوگئی۔ چھوٹا بیٹا ماں باپ کی خدمت کے لئے لاہور ہی میں رہا۔ بیٹی کی شادی کے وقت ماضی نے بند دریچے سے جھانکا اور ماضی کے نقوش دھندلائے پھر سیروسیاحت کے خواب بھی دھندلانے لگے لیکن پھر بھی

یہی سوچا کہ باہر کے سفر بیٹی کے لئے ہونگے۔ ہر سال آتی بھی تھی۔ یہ سوچ کر تسلی ہوئی کہ ہم سفر نہ کر سکے تو ہمارے بچے کر رہے ہیں۔

تین سال بعد بیٹی کے ہاں نئے فرد کے آنے کی امید ہوئی تو بیٹی داماد نے مجھے بلانے کی کوششیں شروع کر دیں، مجھے بھی خوشی کے ساتھ اس کی فکر تو تھی لیکن اپنے حالات بھی آڑے آتے تھے۔ دل چاہا کوئی معجزہ ہو جائے۔ ہر نماز میں دعائیں بھی کرتی کہ بیٹی کے پاس جانے کا کوئی سبب بن جائے کہ اچانک باری تعالیٰ کی رحمت جوش میں آئی۔ ہوا یہ کہ بیٹی نے فون پر رونا دھونا شروع کیا تو باپ سے برداشت نہ ہو سکا۔ پھر دریائے سخاوت جوش میں آیا اور مجھے جانے کا حکم ملا بیٹی کو تسلی دی کہ فکر نہ کرو امی جلد ہی تمہارے پاس ہوں گی۔ اس طرح امریکہ کے پہلے سفر کا آغاز ہوا اور ہاتھ کی لکیروں پر پیار آیا یہ سب کیا تھا.....کوئی خواب یا کسی خواب کی تعبیر!

اس طرح باہر کے کئی سفر ہو گئے۔ امریکہ نہ صرف ایک بلکہ اب چار سفر ہو رہے تھے۔

بیٹے کے پاس بوسنیا گئی وہاں کی بھی خوب سیر کی۔ عمرہ بھی ادا کیا۔ خانہ کعبہ کو اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ اس کا جلال و جمال جیسا کہ سنا تھا آنکھوں کے سامنے تھا اور کئی گنا زیادہ تھا۔ پندرہ دن قیام کے دوران پانچوں نمازوں کی آواز کان میں آتی (کیونکہ ہمارا ہوٹل خانہ کعبہ کے سامنے تھا) اور ہم جلدی سے خانہ کعبہ جا کر نماز ادا کر لیتے۔ بے شمار طواف کئے۔ خانہ کعبہ کو اپنے ہاتھوں سے چھوا بلکہ ماتھا ٹیک کر دعائیں کیں۔ یہ سب کسی معجزے سے کم نہیں تھا۔ اللہ تعالیٰ کی مہربانی تھی جس نے یہ اسباب بنائے۔

یہ 9/11 کا زمانہ ہے۔ امریکہ کے پہلے سفر میں میرے ہم سفر رشتے کے ایک ماموں اور ممانی تھے ان کے ساتھ سفر بہت اچھا گزرا۔ غیر ملکی ایئر لائن تھی۔ وہ بھی بہت آرام دہ، اچھی سروس، مختلف اقسام کے عمدہ کھانے، اور بہترین مہمان نوازی نے بہت متاثر کیا۔

اس کا موازنہ پی آئی اے سے کرو تو بہت دکھ ہوتا ہے۔ با کمال لوگ اور لا جواب پرواز! جس ایئر لائن کو پی آئی اے نے بنایا وہ آج اس سے بہت آگے ہے۔

یہ ہمارا پانچ گھنٹے کا سفر تھا۔ دوسرا جہاز ابوظہبی سے لینا تھا۔ جب ہم ابوظہبی پہنچے تو پتہ چلا کہ ہماری فلائٹ آٹھ گھنٹے لیٹ ہے لہٰذا ہمیں ہوٹل میں ٹھہرایا گیا۔ ابوظہبی کا ائیر پورٹ بھی دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ بے حد بڑا اور بہت خوبصورت۔

وہاں سے بس کے ذریعے ہمیں ہوٹل لے کر گئے۔ یوں اس شہر کی بھی سیر کی۔ بڑی بڑی کھلی صاف ستھری سڑکیں، بلند و بالا عمارات ہرے بھرے درخت، اس راستے کی زینت تھے یہ سب نظارے کرتے ہوئے ہم ہوٹل پہنچے یہ ہوٹل بازار کے عین بیچ میں تھا۔ سب کو الگ الگ کمرے دیئے گئے لیکن ہم تینوں ایک ہی کمرے میں ٹھہرے ہم باتوں میں مصروف تھے کہ اچانک میری نگاہ کھڑکی سے باہر دکان پر لگی تختی پر پڑی جس پر لکھا تھا ہر چیز دو درہم کی۔ یہ دیکھ کر منہ میں پانی آ گیا اور ہم تینوں جھٹ سے اس دوکان میں پہنچ گئے۔ پہلے اپنے پیسے درہم میں تبدیل کئے پھر خوب شاپنگ کی۔ ادھر ادھر نظر ڈالی تو ہر شخص شاپنگ میں مصروف نظر آیا۔

اگلی منزل شکاگو تھی۔ وہاں بیٹی داماد لینے آئے تھے کیونکہ وہاں سے انڈیانا جانا تھا جو تین گھنٹے کا راستہ گاڑی سے تھا لیکن میرے ماموں کو مشی گن کے لئے دوسری فلائٹ لینی تھی۔ یوں ہمارے راستے الگ الگ ہو گئے۔

ہم ابھی سامان کے انتظار میں ائیر پورٹ پر کھڑے تھے اور آتے ہوئے سامان کو دیکھ رہے تھے۔ کافی دیر بعد پتہ چلا کہ میرا ایک سوٹ کیس غائب ہے۔ پہلی دفعہ یہ ہوا تھا اس لئے بہت پریشانی ہوئی۔ زیادہ غم یہ بھی تھا کہ اسی میں بچوں کے تحائف تھے۔ لیکن جب ائیر پورٹ والوں نے کہا کہ جوں ہی آپ کا سامان ملا ہم آپ کے گھر چھوڑ جائیں گے تو یہ سن کر یقین نہیں آیا کہ ایسا بھی ہو سکتا ہے۔ کیا یہ لوگ ہمیں تسلی دے رہے ہیں؟ بہر حال صبر کر لیا اور ہم آ گئے۔ گھر آتے آتے کافی رات ہو چکی تھی۔ سب تھکے ہوئے بھی بہت تھے اس لئے جلد ہی سو گئے۔

صبح صبح گھر کی گھنٹی بجی۔ دروازہ کھولا تو دیکھا کہ سوٹ کیس رکھا ہوا ہے لانے والا نظر نہیں آیا یہ بھی کوئی معجزہ ہی لگا۔ تھوڑی دیر بعد فون کی

گھنٹی بجی یہ میری بھانجی کا فون تھا۔ وہ شمائلہ بیٹی سے بات کر رہی تھی کہ کیا خالہ امی پہنچ گئیں؟ اس نے کہا جی۔ لیکن وہ آواز سے پریشان لگی تو شمائلہ نے کہا خیر تو ہے آپ کچھ پریشان ہیں۔ اس نے کہا ٹی وی کھولو حالات بہت خراب ہیں۔ میں یہی پوچھنا چاہ رہی تھی کہ خالہ امی خیریت سے آ گئی ہیں۔ ٹی وی کھولا تو نو گیارہ کا معرکہ ہوا تھا بار بار ٹی وی پر اس حادثے کو دکھا رہے تھے۔ اس کے ساتھ ہی تمام ائیر پورٹس بند کر دیئے گئے تھے۔ مسلمانوں کی آزمائش کے دن آ گئے تھے۔

ہم نے خیریت سے پہنچنے اور سب سے زیادہ سوٹ کیس ملنے پر لاکھ لاکھ شکر ادا کیا اور نفل پڑھے۔

پھر امریکہ کا دوسرا سفر درپیش ہوا ان دنوں میری بیٹی داماد اسپرنگ فیلڈ میں جو انڈیانا سے دو گھنٹے کی ڈرائیور پر ہے رہائش پذیر تھے۔ یہ بہت خوبصورت سرسبز اور ٹھنڈا علاقہ ہے۔ ستمبر میں بھی وہاں دسمبر جیسی ٹھنڈ تھی۔ میں دو ماہ وہاں رہی۔ آس پاس کے تمام علاقے دیکھے۔ فیری کی سیر کی۔ یہ بڑی انوکھی سیر تھی۔ یعنی سمندر میں جہاز پر ہم گاڑی سمیت بیٹھ گئے اور جہاز ہمیں لیکر گھومتا رہا پھر دوسرے کنارے پر اتار دیا اس کے علاوہ ابراہیم لنکن کا گاؤں دیکھا۔ وہاں پر اس کی پوری زندگی کی عکاسی کی گئی تھی۔ یعنی وہ کون تھا، اس نے زندگی کیسے گزاری اور کس طرح عروج کی منزل پر پہنچا۔ چلڈرن میوزیم دیکھا جو بہت بڑا ہے اور بچوں کیلئے تفریح اور معلومات کا خزانہ ہے۔

جب شمائلہ کے بچے کی پیدائش ہوئی تو گورنمنٹ کا ہسپتال دیکھا صاف ستھرا پرسکون ماحول، بھاگتی دوڑتی اسمارٹ نرسیں اور ڈاکٹر تیمار داروں کے لئے آرام دہ کمرہ جہاں چائے، کولڈ ڈرنک اور کافی موجود۔ جس کا جو دل چاہے پی لے۔ پھر مفت میں بچے کی پیدائش ہوگئی وہ دو دن ہسپتال میں رہی میں بھی اس کے ساتھ تھی اسی کمرے میں بچے کو نرسوں نے رکھا اور تیسرے دن ہم گھر آئے۔ گھر آ کر بھی بہت دن تک بچے کے لئے تحفے آتے رہے میرے لئے یہ سب حیرت انگیز تھا۔

میرے امریکہ کے چار سفر ہوئے۔ چاروں موسم دیکھے۔ یعنی سردی، گرمی، بہار اور خزاں۔ دسمبر جنوری میں ہر طرف برف ہی برف دیکھی۔ تا حد نظر ہر چیز کو برف کی چادر میں لپٹا ہوا دیکھا۔ پھر اس کو قطرہ قطرہ پگھلتے دیکھا۔ زرد اور چمکیلی دھوپ دیکھی۔ سرد ہوا کے جھکڑ دیکھے۔ رنگ بدلتے چنار کے ہرے، پیلے، لال پتے دیکھے۔ ہریالی اور ہر طرف رنگ برنگے خوصورت پھول، سرسبز لق و دق جنگل، ان میں دوڑتے بھاگتے ہرن، گلہریاں، ہر جگہ چشمے جھیلیں اور ان میں تیرتی ہوئی بطخیں جب یہ بطخیں سڑک پر قطار بنا کر گزرتی ہیں تو ساری ٹریفک رک جاتی ہے اور جب تک وہ گزر نہیں جاتیں سب رکے رہتے ہیں۔ کسی کو آگے نکلنے کی جلدی نہیں ہوتی..... اس وقت مجھے خیال آیا کہ یہ لوگ اپنے حیوانات تک کا کتنا خیال کرتے ہیں۔ لیکن عراق، افغانستان اور ویت نام میں انسانی خون کی ہولی کیوں کھیلی گئی کیا وہ جانوروں سے بدتر ہیں؟

پھر دسمبر میں دس دن کی چھٹیاں ہوئیں تو اورلینڈو جانے کا پروگرام بنا۔ وہاں میری بھانجی رہتی ہے اسی شہر میں ڈزنی لینڈ بھی ہے تو اس کی سیر کی۔ وہاں میجک ورلڈ دیکھی۔ اس کا تذکرہ الفاظ میں بیان نہیں ہوسکتا صرف دیکھا جا سکتا ہے۔ یہ سب انسانی تخلیق ہے جو دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ پھر اسپیس کینڈی میں چاند گاڑی دیکھی۔ بلکہ انہوں نے آرم اسٹرانگ کے چاند پر اترنے کی پوری فلم دکھائی یہ سب ایسی جگہیں ہیں کہ ان کو دیکھنے کے لئے چار دن بہت کم تھے۔ ہمارے پاس وقت کم تھا اس لئے ہم سب کچھ پوری طرح نہ دیکھ سکے۔

اسی دن نیا سال شروع ہونا تھا۔ یہ 31 دسمبر کی رات تھی جو ہم نے ڈزنی لینڈ میں گزاری۔ جب رات کے بارہ بجے تو ایک دم سے آتش بازی کا مظاہرہ شروع ہوگیا۔ ایک ہلہ گلہ اور شور شرابا تھا۔ لگ رہا تھا پوری دنیا یہاں اکٹھی ہوگئی ہے۔ میرے لئے یہ سب کسی خواب سے کم نہیں تھا۔ ساری رات ہم نے یہ تماشہ دیکھا۔ صبح ہوتے ہوئے گھر آئے۔ یوں ہم وہاں چار دن رہے اور چار دن سفر میں گزارے۔ یہ ایک طرح سے بائیس گھنٹے کا سفر تھا گاڑی سے یہ راستہ بہت پر لطف گزرا ہوٹلوں میں ٹھہرے تو ان کی مہمان نوازی خوش اخلاقی اور صفائی ستھرائی کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ اونچے اونچے یخ بستہ پہاڑ، جنگل، کشادہ سڑکیں اور ان پر پھیلے ہوئے پلوں کے جال تھے لیکن کسی جگہ بھی گندگی کا ڈھیر نظر

نہیں آیا۔ بڑے بڑے شاپنگ مال اور بچوں کے پارک اور ان میں پیارے پیارے ہنستے مسکراتے دوڑتے بچے دیکھے وہاں بھی ہر طرف صفائی ستھرائی کا احساس ساتھ ساتھ چلتا رہا۔

شائلہ نے ایم ایس سی (maths) کرنے کے لئے پر دو یونیورسٹی میں داخلہ لیا ہوا تھا۔ ہفتے میں تین دن اس کی کلاس ہوتی تھی۔ یونیورسٹی ان کے شہر سے دو گھنٹے دور تھی۔ اب بچے کا مسئلہ تھا کہ اسے میں رکھتی تھی۔ لیکن اس کے جانے کے بعد اکیلے گھر میں ڈر لگتا تھا۔ اس لئے میں اس کے ساتھ جاتی تھی۔ جتنی دیر اس کی کلاس ہوتی میں بچے کے ساتھ گاڑی میں رہتی۔ یہ مشکل سے ایک گھنٹے کی کلاس تھی۔ اس عرصے میں بچہ زیادہ دیر سوتا ہی رہتا تھا۔ ویسے بھی مجھے کوئی پریشانی نہیں ہوتی تھی۔

آخر میں ایک دن اس نے مجھے یونیورسٹی بھی دکھائی۔ وہ اتنی بڑی ہے کہ پنجاب یونیورسٹی جیسی اس میں تین چار سما جائیں۔ بے شمار ڈیپارٹمنٹس ہیں میڈیکل کالج، ہسپتال اور ہوسٹل بھی اسی میں ہیں میں تو صرف میتھس ڈیپارٹمنٹ ہی دیکھ سکی۔ ان کے کلاس روم اور ہال دیکھے جہاں لوگ بیٹھ کر گپ شپ کرتے ہیں۔ اس میں چائے کافی اور کولڈ ڈرنک کا انتظام ہوتا ہے۔ قلم، کاغذ اور بال پوائنٹ میز پر رکھے ہوتے ہیں۔ ایسا لگتا ہے وہاں ہر چیز کی بہتات ہے پڑھانے والے مخلص ہیں۔ لوگ جیسے پڑھنا چاہتے ہیں ویسے ہی ان کو سہولت ملتی ہے۔ اس بات کا احساس یوں ہوا کہ شائلہ کا امتحان ہونا تھا۔ میں پریشان کہ کیسے جائے گی پرچہ دینے تو اس نے اپنے ٹیچر کو ای میل کی کہ میرا یہ مسئلہ ہے اب میں کیا کروں۔ ان کی جواباً ای میل آئی کہ فکر نہ کرو جب آسانی سے دے سکو تو دے دینا تو یوں اس نے ایک ماہ بعد پیپر دیا۔ سب کام کمپیوٹر پر ہو گیا اور وہ پاس بھی ہو گئی۔ ان حالات سے اندازہ ہوتا ہے لوگ کس قدر مددگار ہیں، لوگوں کے مسائل کو سمجھتے ہیں اور امتحان کو ہوّا نہیں بناتے جبکہ یہاں ہمارے ملک میں اس کے برعکس ہے کہ اگر وہ وقت پر امتحان نہ دیتی تو اسے فیل تصور کیا جاتا۔

وہاں پڑھائی کی بہت آسانیاں ہیں بچوں کی تعلیم کا بھی یہی حال ہے۔ ان کی کتابیں اسکول میں ہی رہتی ہیں۔ وہ صرف لنچ لیکر جاتے ہیں بچوں کے کھیل اور فنکشن بھی ہوتے ہیں بچوں کو دنیا میں رہنے اور زندگی گزارنے کا سلیقہ اسکول والے سکھاتے ہیں۔ سردی کا تقریباً پورا موسم میں نے وہیں گزارا اور تین ماہ بعد وطن واپس آئی۔

پھر تین سال بعد دوسرے بچے کی پیدائش پر گئی یہ میرا تیسرا سفر تھا۔ فروری کا مہینہ تھا جب بھی چار ماہ وہاں رہی دوبارہ ڈزنی لینڈ جانا ہوا اس کا جو حصہ باقی رہ گیا تھا اس کو دیکھا۔ اورلینڈو امریکی ریاست فلوریڈا کا ایک شہر ہے یہاں پر ڈزنی کے تمام کردار ہیں۔ بے شمار دوکانیں ہیں جہاں پر کپڑوں، جوتوں، برتنوں اور کھلونوں غرض ہر چیز پر یہ کردار آپ کو بنے ہوئے ملتے ہیں۔ مکی ماؤس اور منی ماؤس کے زندہ کردار ہر طرف گھومتے رہتے ہیں جن کے ساتھ بچے اپنی فوٹو بنواتے ہیں اور وہ طرح طرح کے تماشے دکھاتے ہیں۔

یہاں سینڈریلا کا محل ہے جس میں اس کی پوری کہانی پیش کی جاتی ہے جھیلیں ہیں جن میں ڈولفن مچھلیاں کرتب دکھاتی ہیں۔ اسنو وائٹ ایک بچی کی شکل میں سفید کپڑوں میں مسکرا کر بچوں سے ہاتھ ملاتی ہے۔

کشتی کی سیر بھی کروائی جاتی ہے۔ جس میں بیٹھ کر پورا ڈزنی ورلڈ دیکھ سکتے ہیں۔ ہوٹل ہیں، دوکانیں ہیں بچوں کے طرح طرح کے جھولے ہیں جن میں سب سے مزے دار پیالیوں میں بیٹھنے والا جھولا تھا۔ اس کے علاوہ ایک ایسا حصہ ہے جو پھولوں پودوں اور درختوں سے سرسبز ہے۔ اس جگہ کو (EPCOT) کہتے ہیں یہاں پر پوری دنیا میں جو پھول لگائے جاتے ہیں جیسے چین، جاپان، انگلینڈ وغیرہ وہ ہر طرح کے پھول آپ کو یہاں ملیں گے جن کو بڑی خوبصورتی سے لگایا گیا ہے۔

اس کے علاوہ شکاگو بھی گئے یہ بہت بڑا اور خوبصورت شہر ہے یہ گرمیوں کے دن تھے بہت لوگ سیر کو آئے ہوئے تھے۔ یہاں پر لوگوں کی سب سے بڑی تفریح کشتی رانی ہے دور دور سے لوگ یہاں آتے ہیں۔ بہت سے لوگوں کے پاس اپنی کشتیاں بھی ہیں۔ وہ ان کو لیکر آتے ہیں اور سمندر کی سیر کرتے ہیں۔

شکاگو میں پرانا علاقہ بھی ہے جو تنگ سڑکوں اور قدیم عمارتوں سے مزین ہے جس کو اولڈ سٹی یا (downtown) کہتے ہیں۔ روشنیوں سے

اس طرح مزین ہے کہ وہاں رات کو بھی دن کا سماں ہوتا ہے۔اسے بھی خاص طور سے لوگ دیکھنے جاتے ہیں۔شکاگو بہت بڑا شہر ہے اور بہت خوبصورت، جو اپنے پارکوں، دریاؤں اور شاپنگ کے لئے مشہور ہے۔ موسم بھی ٹھنڈا ہے اور سردیوں میں خوب برف باری ہوتی ہے۔

یہاں مسلمانوں کے بہت سے مدرسے ہیں جہاں سے بچے حافظ بن کر نکلتے ہیں۔درس وتبلیغ کے مراکز ہیں جہاں پر ہر سال پوری دنیا سے لاکھوں لوگ آتے ہیں یہ اسنا (isna) کا اجتماع کہلاتا ہے۔مذہبی اجتماع کے ساتھ یہاں ادبی پروگرام بھی ہوتے ہیں جن میں مشاعرے اور گانوں کی محفلیں خوب سجائی جاتی ہیں اگرچہ ہمارا ایسے کسی پروگرام میں جانے کا اتفاق نہیں ہوا کیونکہ چھوٹے بچوں کے ساتھ کسی کے ہاں رہنا اچھا نہیں لگتا تھا اس لئے ہم دو دن سے زیادہ کبھی نہیں رہے۔غرضیکہ ہر جگہ کی اپنی خصوصیات ہیں جو سب اپنی روایات اور خوبصورتی میں مثالی ہیں۔

میں جون تک شائلہ کے پاس رہی۔جون میں اس کا ایک امتحان ہوگیا۔لیکن آخری امتحان دسمبر میں تھا۔اس وقت میں اس کے پاس نہیں جاسکی۔لیکن مشکل حالات اور دو بچوں کے ساتھ جن میں ایک بچہ چھ ماہ کا تھا، اس نے وہ امتحان بھی دے دیا اور خدا کے فضل وکرم سے پاس بھی ہو گئی۔اس کامیابی میں اس کے شوہر کی مدد شامل ہے۔شائلہ گورنمنٹ کالج لاہور سے شماریات میں ایم ایس سی کر کے گئی تھی اور وہاں اس نے ایم ایس سی (maths) کیا۔ان کے شوہر انجینئر ہیں اور ان کی پوری تعلیم امریکہ میں ہی ہوئی ہے۔

آج کل یہ لوگ انڈیانا کے شہر فشر (Fisher) میں مقیم ہیں یہ ایک چھوٹا سا علاقہ ہے اور بہت خوبصورت ہے۔قدم قدم پر جھیلیں اور فوارے ہیں۔بڑے بڑے گھر ہیں یہ محفوظ علاقہ تصور کیا جاتا ہے جہاں پر جرائم نہیں ہوتے۔سردی بھی خوب ہوتی ہے اور سردیوں میں یہ علاقہ برف سے ڈھکا رہتا ہے۔مئی کے مہینے میں بھی موسم بہت اچھا تھا۔ہر دوسرے دن بارش ہو جاتی تھی۔

اس دفعہ یعنی 2015 میں آٹھ سال بعد میں اس کے پاس گئی تھی۔ شائلہ آج کل اپنی یونیورسٹی سمیت دو یونیورسٹیوں میں سمسٹر سسٹم کے تحت پڑھا رہی ہے۔ان کے بہت سے مسلمان ملنے والے ہیں۔سب مل جل کر ایک خاندان کی طرح رہتے ہیں اور ایک دوسرے کے کام آتے ہیں۔شائلہ کے بچے جب چھوٹے تھے اور یہ پڑھتی تھی اس وقت بچوں کو دوسرے لوگ ہی رکھتے تھے۔یہ محض ان کا خلوص تھا۔

اس دفعہ میں گرمیوں میں گئی تھی۔بچوں کی چھٹیاں تھیں اور ان کو انتظار تھا کہ نانی آئیں تو ہماری آمین ہو۔لہٰذا رمضان سے پہلے یہ کام بھی ہوا۔ایک پاکستانی ہوٹل میں یہ چار سو لوگوں کی تقریب تھی۔اس میں بچوں نے قرأت کے ساتھ قرآن مجید سنائے۔اس کے بعد کھانا ہوا جس میں قورمہ، بریانی، روسٹ، سبزی تھی، بچوں کے لئے پیزا اور نوڈلز بھی شائلہ نے کیک بنائے تھے جو کتاب کی شکل کے تھے ایک پر اقرأ لکھا تھا اور دوسرے پر ''رب زدنی علما'' لکھا تھا۔لوگوں کو کیک کا یہ آئیڈیا بہت پسند آیا۔سب نے خوب تعریف کی اور تصویریں لیں۔شائلہ نے کیک بنانے کا پورا کورس کیا ہے جس میں وہ تین طرح کے کیک بناتی ہے۔سالگرہ کے، شادی کے، اور شادی کی سالگرہ کے یہ تینوں اپنی نوعیت کے لحاظ سے منفرد ہوتے ہیں۔ان کی سہیلیاں اس سے فائدہ اٹھاتی ہیں۔خوب فرمائشیں ہوتی ہیں اور کیک بنواتی ہیں۔غرضیکہ یہ بہت اچھا فنکشن تھا۔لوگ بچوں سے بہت متاثر ہوئے یہاں تحفے زیادہ تر پیسوں کی شکل میں ملتے ہیں۔

بچوں کو ایک عرب خاتون قرآن پڑھاتی ہیں اس وجہ سے ان کا لہجہ بالکل عربی لگتا ہے۔لیکن ناغے بھی خوب کرتی ہیں اس لئے شائلہ نے آن لائن فیصل مسجد کے ایک قاری صاحب بھی لگائے ہوئے ہیں۔ وہ بچوں سے بہت خوش ہیں۔جب میں جانے والی تھی تو قاری صاحب نے بچوں سے پوچھا پاکستان سے کچھ چاہیے تو بتاؤ نانی کے ہاتھ بھیج دونگا۔ بچوں نے ان سے خوب فرمائشیں کیں جن میں کرکٹ کے بیٹ اور ٹی شرٹ (جیسی کھلاڑی پہنتے ہیں) شامل تھی کیونکہ ان دنوں ورلڈ کپ ہو رہا تھا۔قاری صاحب نے دونوں کے لئے ٹی شرٹ پر نام لکھوا کر اور بیٹ بال کے علاوہ بہت سی اسلامی کتابیں انہیں بھیجیں۔

میرے چھوٹے نواسے کا نام محبّ ہے۔وہ آٹھ سال کا ہے اور

ماشاءاللہ بہت ذہین ہے اور کوشش کرتا ہے کہ ہر بچے سے آگے رہے۔ اپنے بڑے بھائی تک کو ہرانے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ اب چوتھے سپارے پر ہے۔ بہت اچھی قرأت کرتا ہے صبح چھ بجے اٹھ کر بچے قرآن یاد کرتے ہیں پھر اسکول جاتے ہیں۔ شام کو قاری صاحب بیٹھ جاتے ہیں۔ وہ سنتے ہیں اور آگے سبق دیتے ہیں۔ بڑے بھائی گیارہ سال کے ہیں وہ پاکستانی حساب سے ساتویں کلاس میں ہیں ان کا نام طلحہ ہے۔ وہ بھی بہت ذہین اور سمجھدار ہیں ان کو قرآن حفظ کرنے میں زیادہ دلچسپی نہیں ہے لیکن اس لئے کر رہے ہیں کہ محبّ کر رہا ہے اس کے علاوہ اسکول میں گیمز وغیرہ ہوتے ہیں اس میں حصہ لیتے ہیں اور انعامات بھی حاصل کرتے ہیں۔ اس دفعہ رمضان میں مسجد میں جس کا نام الہدیٰ ہے قرأت کے مقابلے ہوئے تو دونوں بچوں نے انعام حاصل کئے۔ دونوں کو پچاس پچاس ڈالر ملے۔ دونوں پیسوں کا حساب کتاب خوب رکھتے ہیں۔ اکثر فرمائش کرتے ہیں تو شائلہ کہتی ہے اپنے پیسے خرچ کرو، تو کہتے ہیں وہ ہم نے (Furthareducation) کیلئے جمع کئے ہیں کیونکہ انہوں نے سن رکھا ہے کہ یونیورسٹی کی تعلیم بہت مہنگی ہے اس لئے پیسے جمع کریں گے تو آگے پڑھ سکیں گے ماں باپ پر بوجھ ڈالنا نہیں چاہتے۔ ابھی سے ان بچوں کی یہ سوچ ہے۔

میرے روزے بھی وہیں ہوئے۔ موسم بہت اچھا تھا اس لئے وقت اچھا گزر گیا حالانکہ روزے کا وقت کافی لمبا تھا لیکن کسی قسم کی تکلیف کا احساس نہیں ہوا۔ ہر اتوار کو مسجد میں افطار پارٹی ہوتی تھی۔ تراویح کا بھی بہت اچھا انتظام تھا۔ خواتین بھی مسجد میں تراویح پڑھتی تھیں۔

روزوں کے بعد عید کی نماز بہت بڑے ہال میں ہوئی۔ ہزار کے قریب لوگ ہوں گے اس کے بعد کھانے کا انتظام تھا۔ بچوں کے لئے پلے لینڈ تھا جہاں نماز کے بعد بچے ایسے مصروف ہوئے کہ جیسے ان کا گھر جانے کا کوئی ارادہ ہی نہیں تھا۔ بڑے لوگ باتوں میں مصروف تھے۔ یوں وقت کا احساس ہی نہیں ہوا، لہٰذا چار بجے شام کو واپسی ہوئی۔

اس کے بعد لوگوں کے گھروں میں دعوتوں کا سلسلہ شروع ہوا جس کو عید ملن پارٹی کہا جاتا ہے۔ ہر گھر میں تقریباً چار فیملیز تو ضرور مدعو ہوتی تھیں ورنہ بہت لوگ تو دو سو اور تین سو لوگوں کو بھی بلا لیتے ہیں۔ گھر بڑے بڑے ہیں۔ نیچے ڈرائنگ، ڈائننگ، ٹی وی لاؤنج اور بیڈروم اوپر ہوتے ہیں جو تین یا چار ضرور ہیں۔ اکثر گھروں میں بیسمنٹ بھی ہیں۔ دعوت کے موقع پر بیسمنٹ میں مرد ہوتے ہیں درمیان والے حصے میں خواتین اور اوپر بچے کھیلتے ہیں۔ یا موسم اچھا ہے تو لان میں بچے ہوتے ہیں جن کے کھیلنے کے لئے وہاں بھی جھولے وغیرہ ہوتے ہیں۔ ان پارٹیز میں بھی کئی قسم کے کھانے ہوتے ہیں۔ آنے والے مہمان تحفے لیکر آتے ہیں۔ کھانوں میں بچوں کی پسند کا خاص خیال رکھا جاتا ہے۔

یہ دعوتیں زیادہ رات تک جاری نہیں رہ سکتی ہیں کیونکہ آپ کے پڑوسی انگریز ہیں تو وہ پولیس کو بلا لیتے ہیں اور پولیس مداخلت کرتی ہے اور محفل برخاست کرواتی ہے۔ اس لئے آٹھ یا نو بجے تک سب اپنے گھروں کو چلے جاتے ہیں۔ یہ پارٹیاں عام طور پر ہفتے کی رات کو ہوتی ہیں۔ غرضیکہ دعوتوں کا سلسلہ بھی کافی دن تک چلتا رہا۔

بچوں کی چھٹیاں ختم ہونے والی تھیں تو کہیں باہر کی سیر کا پروگرام بنایا گیا۔ بچوں کا اصرار تھا کہ نیو یارک جائیں کیونکہ وہاں دیکھنے اور گھومنے کے لئے بہت کچھ ہے۔ لیکن سب نے کہا کہ نیو یارک کی سیر کرنے کے لئے کم سے کم ایک ہفتہ تو لازمی ہونا چاہئے۔ اور میرے داماد کو چھٹی نہیں مل سکتی تھی۔ اس لئے انہوں نے دو دن کی چھٹی لی، ہفتہ اتوار ساتھ ملائے، اسی طرح شائلہ نے بھی، تو ہم لوگ جمعہ کی شام کو گھر سے نکلے اور نیاگرا فال دیکھنے کا پروگرام بنا۔ یہ جگہ ان کے گھر سے آٹھ گھنٹے دور ہے۔ جمعہ کی شام کو گھر سے بمعہ ساز و سامان کے نکلے طلحہ نے تو اپنی رضائی اور تکیہ بھی رکھ لیا کیونکہ وہ صرف اپنی ہی چیز استعمال کرتے ہیں۔ رات کو ہم لوگ ایک ہوٹل میں ٹھہرے صبح کسی پاکستانی ہوٹل سے ناشتہ کیا اور پھر منزل کی طرف روانہ ہوئے۔

نیاگرا فال کینیڈا اور امریکہ کے بارڈر پر ہے اس شہر کو نیو یارک اسٹیٹ کہتے ہیں۔ اس سے چار گھنٹے کی ڈرائیو پر نیو یارک سٹی ہے۔ اور وہ اصل نیو یارک ہے۔

نیاگرا فال بہتے ہوئے پانی کا بہت بڑا چشمہ ہے۔ جو بہت بلندی

سے اور بہت زور وشور سے بہہ رہا ہے۔ جب نیو یارک اسٹیٹ میں داخل ہوں تو ٹکٹ لینے کے لئے اس کے دفتر جانا پڑتا ہے۔ وہاں پر ہم پانچ لوگوں کے لئے پانچ سو ڈالر کے ٹکٹ آئے۔ وہاں سے ان کی بس ہمیں اس جگہ لے کر گئی جہاں نیاگرا فال شروع ہوتا ہے۔ دوران سفر بس ڈرائیور نے راستے میں آنے والی تمام جگہوں کی معلومات دیں۔ یوں پورے شہر کی سیر کرتے ہوئے اصل مقام تک گئے۔ نیاگرا فال پہنچ کر سب لوگوں کو ربڑ کے چپل اور اوور آل دیئے گئے تاکہ کپڑے پانی کے چھینٹوں سے محفوظ رہیں۔

یہ امریکہ کا بارڈر ہے اور چشمے کے دوسری طرف کینیڈا کا۔ اس لئے کینیڈا کا جھنڈا اور ادھر کی بلند و بالا عمارات صاف طور پر نظر آ رہی تھیں۔ یہاں سب کو بہت بڑے جہاز میں لے کر سمندر میں چاروں طرف گھمایا گیا تاکہ لوگ ہر طرف سے اس گلیشئر کو دیکھیں۔ پانی کے چھینٹے خوب سب کو بھگو رہے تھے، اوور آل بھی بے کار تھا۔ لیکن پھر بھی مزہ آ رہا تھا۔

اس گلیشئر کے بہنے کی رفتار اتنی تیز تھی کہ ذہن سوچنے پر مجبور تھا کہ اتنا پانی کہاں سے آ رہا ہے اور کہاں جا رہا ہے۔ یہ قدرت کا عجیب شاہکار ہے جو اتنی رفتار سے بہہ رہا ہے پانی کے نیچے گرتے ہی آسمان کی طرف دھوئیں کا بادل اٹھتا ہے جس میں ہر چیز دھندلا جاتی ہے۔ یہ بادل آسمان تک جاتا ہے اور پھر قوسِ قزح بن جاتا ہے جو کبھی پوری اور کبھی آدھی بنتی ہے۔ یہ منظر اتنا حسین ہے کہ انسان اس میں کھو جاتا ہے۔ ہم نے یہ سب امریکہ کے بارڈر سے دیکھا لیکن لوگ کہتے ہیں اس کو کینیڈا سے دیکھیں تو اور بھی حسین منظر پیش کرتا ہے۔

یہ اتوار کا دن تھا۔ اس رات کو وہاں آتش بازی کا بھی مظاہرہ ہوتا ہے لہٰذا ہم نے وہ بھی دیکھا۔ کینیڈا کا ایک بہت بڑا مینار اور عمارات رات کو دیکھنے سے تعلق رکھتی ہیں۔ ان کی روشنیاں جو رنگ بدل رہی تھیں، ان جلتی بجھتی رنگین روشنیوں نے آنکھوں کو خیرہ کر دیا۔ اس پر آتش بازی کا لاجواب مظاہرہ، یہ سب رات کو دو بجے تک ہوتا رہا۔ دو بجے واپس آئے اور رات وہیں کے ایک ہوٹل میں گزاری صبح ناشتے کے لئے ایک پاکستانی ہوٹل میں ہم نے کباب، پراٹھے اور آلو چھولے کھائے بچوں کا اصرار تھا کہ نیو یارک سٹی چلیں لیکن بچوں کے ابا نے وقت کی کمی کا احساس دلایا اور وہیں پر سیر کرا دی۔ وہاں پر بچوں کے پارک اور جھیلیں ہیں جن میں لوگ کشتی رانی کر رہے تھے۔

ہم نے ایک ایسا ادارہ دیکھا جو واقعی قابل تعریف تھا۔ وہاں ہر عمر کے لوگوں کو مختلف قسم کے ہنر سکھائے جاتے ہیں۔ پھر ان کے مقابلے بھی ہوتے ہیں۔ ایک اسکول تھا وہاں گئے تو ایک معمر خاتون کو رضائی بناتے دیکھا جو سندھ کی رلی کی طرح کی تھی۔ یعنی کپڑوں کے چھوٹے چھوٹے رنگ برنگے ٹکڑے تھے جن کو وہ مشین سے جوڑ رہی تھیں یہ بہت خوبصورت اور محنت طلب کام تھا۔ پھر ان خاتون کی عمر دیکھی تو اور بھی رشک آیا۔ جب ہم نے ان میں دلچسپی لی اور تعریف کی تو وہ بھی بہت خوش ہوئیں اور اپنے کام کی تفصیلات بتائیں۔ وہ میگزین دکھائے جن میں ان کی چیزیں چھپتی ہیں اور حکومت کی طرف سے ان کی نمائش لگتی ہے اور انعامات ملتے ہیں۔ غرضیکہ یہ تفریح بہت دلچسپ رہی اور یوں ہم اسی شام واپس ہوئے۔

وہاں یوم آزادی کا دن بھی بڑے جوش وخروش سے منایا گیا۔ وہاں ایک تنظیم ہے جس کو ''پاکستان امریکہ فرینڈ شپ ایسوسی ایشن'' کا نام دیا گیا ہے اس کے تحت امریکہ اور پاکستان دونوں مل کر اپنے تہوار مناتے ہیں اور جو لوگ اس کے ممبر ہیں وہ ای میل کے ذریعے تمام لوگوں کو وہاں ہونے والے فنکشن کے بارے میں بتاتے ہیں۔ فنکشن کے لئے ٹکٹ بہت مہنگے ہوتے ہیں، جو خرید سکتے ہیں صرف وہی جاتے ہیں۔

شمائلہ کے پاس ای میل آئی کہ یہ لوگ بچوں کے ڈرائنگ اور مضمون نویسی کے مقابلے کر رہے ہیں۔ بچوں کو تیار کرو۔ تین چار دن پہلے یہ ای میل آئی۔ اب شمائلہ نے بچوں کی تیاری شروع کی۔

محبّ نے ڈرائنگ میں حصہ لیا، اس میں پاکستان کی ثقافت دکھائی تھی۔ طلحہ نے مضمون نویسی میں حصہ لیا، اس میں پاکستان اور امریکہ کی تہذیب کے بارے میں لکھنا تھا۔ اور بھی بہت سے بچوں نے حصہ لیا..... محبّ کو پہلا انعام ڈرائنگ میں ملا اور طلحہ نے بھی پہلا انعام مضمون نویسی میں حاصل کیا۔ انہوں نے بچوں کو میڈل اور سرٹیفکیٹ

دیئے ۔جس دن یہ فنکشن ہونا تھا ہم سب بھی گئے پینتیس ڈالر کا ایک ٹکٹ تھا شام کو یہ فنکشن ہونا تھا یہ بھی اپنی نوعیت کا بہت اچھا پروگرام تھا۔ اسٹیج پر امریکہ اور پاکستان کا جھنڈا لہرا رہا تھا۔ایک انگریز خاتون شلوار قمیض اور دوپٹے میں ملبوس تھیں ۔ وہ پاکستانی صاحب کے ساتھ ملکر کمپیئرنگ کررہی تھیں ۔ پہلے پاکستانی ترانہ ہوا۔ پھر پاکستانی شادی کی رسومات دکھائی گئیں ۔اس کے علاوہ پاکستانی ننھے بچوں نے بھی گانے ، لڈی ڈالی گئی ،بچوں کوانعامات ملے ۔سب سے بچوں کا تعارف کرایا گیا۔ پھر آٹھ بجے کھانا تھا جس میں کھانوں کی بہت زیادہ ورائٹی تھی ۔ یہاں انگریز بھی مدعو تھے ۔کھانے کے بعد پھر پروگرام تھا، باقاعدہ گانے والے آئے تھے ، انہوں نے سوہنی دھرتی اور دل دل پاکستان کے علاوہ بہت سے اور پنجابی نغمے سنائے ۔ہم نے پورا پروگرام نہیں سنا کیونکہ بچوں کو ان گانوں سے دلچسپی نہیں تھی اور ان کی سمجھ میں بھی نہیں آرہے تھے ۔ ویسے بھی رات زیادہ ہوگئی تھی ۔اس لئے ہم رات بارہ بجے تک گھر آ گئے ۔

اس ایسوسی ایشن کا مقصد یہ ہے کہ مسلمان اپنی تہذیبی روایات انگریزوں کو بتائیں اور انگریز مسلمانوں کو پھر جس کو جو پروگرام اچھا لگتا ہے وہ اس میں شرکت کرتا ہے ۔ میرے خیال میں یہ اچھا پروگرام ہے اس طرح لوگ بھی ایک دوسرے سے مل لیتے ہیں پردیس میں رہنے والے بچوں کو بھی کچھ معلومات اپنے ملک اور تہذیب کے بارے میں ہوتی ہیں ان میں مقابلوں میں حصہ لینے کا جذبہ پیدا ہوتا ہے، انعام ملتا ہے تو خوش بھی ہوتے ہیں ۔شادی بیاہ کی رسومات ، علاقائی نغموں کے علاوہ کمپیئرنگ اور بچوں کا تعارف انگریزی میں ہوا کیونکہ بچے زیادہ انگریزی ہی سمجھتے ہیں ۔

ان سب تفریحات کے علاوہ امریکہ میں گیراج سیل لگنے کا بھی رواج ہے اس میں یہ ہوتا ہے کہ لوگ وہ اشیاء جن سے ان کا دل بھر جاتا ہے یا جو لوگ شہر چھوڑ کر جارہے ہوتے ہیں وہ گرمیوں کے موسم میں اپنے گیراج میں میز پر چیزیں سجا کر ان پر قیمتیں لکھ دیتے ہیں ۔اس طرح جو لوگ وہاں سے گزرتے ہیں اگر چاہیں تو خرید بھی لیتے ہیں ۔سڑک کے کناروں پر گیراج سیل کے بورڈ بھی لگا دیتے ہیں ۔اس میں بعض دفعہ بہت نایاب چیزیں بھی مل جاتی ہیں ۔ان کی قیمت بھی مناسب ہوتی ہے ۔اسی طرح (GoodWill) کے نام سے اسٹور ہیں جہاں لوگ اپنا پرانا سامان دے دیتے ہیں ۔ وہاں پر کتابوں سے لیکر جوتے کپڑے ڈیکوریشن اور فرنیچر غرضیکہ ہر چیز ہوتی ہے ۔ وہاں بھی لوگ شاپنگ کرتے ہیں ۔

اس کے علاوہ بہت بڑے بڑے شاپنگ مال ہیں وہاں خریداری کرنا آسان ہے جن چیزوں پر قیمت لکھی ہوتی ہے آپ جائیں اور اٹھا لیں پھر کاؤنٹر پر جا کر لائن میں لگ کر بل بنوالیں اگر کوئی چیز جیسے مشینری یا کپڑے وغیرہ خراب ہوجائیں اور آپ کے پاس اس کی خریدنے کی رسید ہے تو وہ بھی واپس لے لیتے ہیں اس کی جگہ آپ کو پیسے مل جاتے ہیں یہ سسٹم مجھے بے حد پسند آیا۔ثمائلہ اپنی رسیدیں سنبھال کر رکھتی ہے اور چیزیں بدلتی رہتی ہے ۔ ان کے میاں کا کہنا ہے کہ سب پاکستانی خواتین یہ حرکتیں کرتی ہیں ۔بچوں کے اسکول میں بھی سیل لگتی ہے تاکہ بچوں کو خرید وفروخت کرنا آئے ۔امریکی بچوں سے خاص طور سے بہت محبت کرتے ہیں ۔اسکول میں کوئی بھی بچوں کو ڈانٹتا تو درکنار غلط بھی نہیں کہہ سکتا ہے ۔ایک دوسرے کا بھی خیال رکھتے ہیں ۔ جانور تک کو جان سے عزیز رکھا جاتا ہے ۔بعض موقعوں پر مجھے احساس ہوا کہ یہ اتنے اچھے ہوکر مسلمانوں کے دشمن کیوں ہیں ۔ ویت نام ، افغانستان ، عراق میں بے دردی سے انسانی خون بہایا گیا پھر جارج بش کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔مگر اس کا کیا فائدہ جب عراق تباہ و برباد ہوگیا.....لاکھوں لوگ بے خانماں اور ہزاروں شہید ہوئے کیا بش کا احساس جرم ان کے تمام نقصانات کا ازالہ کرسکتا ہے؟ ہمارے قبائلی علاقے برباد ہوگئے ، لاکھوں بچے بے گھر ہوگئے ۔

قصور ہمارا بھی ہے ۔اگر ہم اتفاق سے رہیں تو کوئی کیسے ٹیڑھی نگاہ ڈال سکتا ہے ۔

بہر حال ، میرا دل تو وہاں یوں لگتا ہے کہ وہاں میرے بچے ہیں ، اور جہاں بچے ہوں وہاں ہم بھی خوش !

☆.....☆.....☆

عورت اور صبر

میں وومن پروٹیکشن بل کو درست نہیں سمجھتی ۔مگر بحث کے دوران مجھے اس کی مخالفت کرنے والے حلقوں کا ذہن پڑھنے کا بھی اچھا موقع ملتا رہا۔

عورت پر تشدد کی بحث کے دوران متعدد لوگوں نے عورت کے لئے صبر تجویز کیا، یہ وہی صبر ہے جو ہندو معاشرے کی عورت صدیوں سے کرتی چلی آ رہی ہے یہاں تک کہ جب اسے ستی بھی کیا جاتا تھا تو اسے صبر سے اگنی میں جلنا ہوتا تھا۔ نبی کریمؐ نے بچیوں کو زندہ درگور کرنے پر ہم مسلمان عورتوں کو صبر کی تلقین نہیں کی بلکہ عورت کو ظلم سے نکالا اور زمانہ جاہلیت کی رسموں کو ختم کیا۔ یہ جو ظلم پر صبر ہے، یہ ہندو کا دیا ہوا ہے جو ہر عورت کو کرنا ہوتا ہے۔ دین کے علمبردار شاید اسے اسلامی سمجھ بیٹھے ہیں۔ عورت پر بے جا تشدد کا کوئی جواز درست نہیں ہوسکتا، بدزبانی وغیرہ بھی نہیں ۔ قانوناً شرعاً اخلاقاً عورت پر تشدد قابل سزا فعل ہے ۔اس پر بھی کوئی دو رائے نہیں ہوسکتی ۔صبر کرنا عورت کی اپنی صوابدید ہے۔ نہ کرے تو اسے برا کہنا معاشرے کا کام نہیں نہ ہی وہ شریعت کے مطابق گناہ گار قرار دی جاسکتی ہے ۔ظلم پر صبر نہ کرنے کا فیصلہ کرنا اسکا حق ہے قانوناً اخلاقاً شرعاً، ریاست علما اور معاشرے کا فرض اس کو انصاف دلانے کے لئے کوشش کرنا ہے نہ کہ اسے ظلم پر صبر کی تلقین کرنا ۔ معاشرے کا کام ایسے مرد کی مذمت کرنا ہے۔اس کو ظالم قرار دینا ہے۔اس کو گھر اور بچوں کی خرابی سے ڈرانا ہے ۔اس کے فعل کو رسوا کرنا ہے کہ وہ اسے کرتے ہوئے شرمائے جبکہ مذمت عورت کی کی جارہی ہے۔

میں پھر کہوں گی دینی حلقوں میں صبر نہ کرنے پر عورت کی مذمت کی جاتی ہے۔ظلم پر صبر نہ کرنے والی عورت رسوا کی جارہی ہے۔علماء اور اسلام کے نام لیواؤں کا کام عورت پر تشدد کی شرعی سزا سوچنا ہے۔اس کا شرعی جواز کلیئر کرنا ہے، عورت کو گھر کے ٹوٹنے سے ڈرانا نہیں ۔اس جرم کے خلاف ہر طرح عورت کا ساتھ دینا اور معاشرے کو ظلم سے آگاہ کرنا علما کا فرض ہے ۔ اگر عورت بری بد اخلاق بدزبان ہے اور مرد کی اپنی طرح بدکردار بھی ہے تو ہمارے علمائے کرام مرد کو صبر کی تلقین کیوں نہیں کرتے ؟

قرآن وحدیث میں اللہ تعالیٰ نے صبر کی بہت زیادہ تلقین کی مگر عورت اور مرد دونوں کے لئے جبکہ برصغیر کے ہندو معاشرے نے صبر کا بوجھ صرف ستی ہونے والی عورت پر ہی ڈالا ۔علمائے کرام نے بھی صبر محض عورت کے لئے مختص کیا۔ جب گھر ٹوٹا تو اس کا ذمہ دار عورت کی عدم برداشت کو قرار دیا، مرد کی عدم برداشت کو نہیں، اس رویے نے مرد کو شہ دی آج سیکولر لوگ کیوں نہ ہماری کمزوریوں ، کمیوں کا فائدہ اٹھائیں ، انکو قصوروار قرار دینے کی بجائے ہم اپنے گریبانوں میں جھانکیں۔

برصغیر کے دیندار طبقے نے ہندو معاشرے کی بہت سی باتوں کو اسلام سمجھ لیا جس میں عورت کا مقام اور رول بھی ہے، جس معاشرے میں جہیز ہو یعنی مرد کی قیمت لگتی ہو اس میں عورت بے وقعت ہو جاتی ہے۔جس معاشرے میں صحیح معنوں میں حق مہر ہو یعنی عورت کی قیمت مرد کو ادا کرنی پڑے، اس میں مرد فرعون نہیں بنتا، بلکہ وہ بھی گھر ٹوٹنے سے ڈرتا ہے کیونکہ اسے نئی عورت کے لئے مال خرچ کرنا ہوتا ہے۔ ہندو معاشرے میں گھر ٹوٹنے پر مرد کی نئی شادی بمع جہیز ! ہوتی ہے، وہ کیوں نہ مارے عورت کو ایک ماں ایک بہن ایک بیٹی ایک بیوی کو جب مار پڑتی ہے تو پورے کا پورا معاشرہ اس سے صبر کی توقع کرتا ہے، جب کہ پورے کے پورے معاشرے کو اس کی حرمت کے لئے کھڑا ہو جانا چاہیے کیا ہم نے کبھی سوچا کہ برصغیر کی عورت کا گھر بسنے کی وجہ کیا ہے؟

صبر نہ کرنے پر عورت کا گھر ٹوٹ جاتا ہے۔ درست

عورت جب ہندو کا دیا ہوا صبر کرتی تھی تب گھر نہیں ٹوٹتا تھا۔ درست

یاد ہے نا، اس کو کہہ دیا جاتا تھا کہ شوہر کے گھر سے اسکا جنازہ ہی واپس آئے، جبکہ اسلام نے عورت کے باپ اور بھائی پر اس کی ذمہ داری ڈالی اگر وہ طلاق لے، اسلام میں عورت کے بڑے ٹھکانے ہیں۔ ہندو عورت کہاں جاتی! کون اس کا گھر دوبارہ بسانے کے لئے دوبارہ جہیز بنائے؟ بہتر ہے کہ خاوند کے ساتھ ستی ہو جائے۔ آج بھی مسلمان عورت کے مسائل وہی ہیں۔ برصغیر کے اسلام نے عورت کو ہندو نظام سے نکالنے کی انقلابی کوشش نہیں کی۔

گھر ٹوٹنے کا الزام کس کو ملا؟

اگر گھر ٹوٹ جائے تو سب الزام بھی عورت ہی کو دیتے ہیں۔ بالکل اسی طرح جیسے حال میں ہی بل آنے کے بعد جو پہلی طلاق ہوئی جب عورت نے رپورٹ کروائی تو باہر آنے کے بعد شوہر نے سب سے پہلے اسے طلاق دی۔ لوگوں کی بات درست ثابت ہوگئی۔ سوشل میڈیا پر کیسے شور مچایا گیا، ہم نہ کہتے تھے ہم نہ کہتے تھے، ایک طبقے نے عورت پر ہی الزام دھرا۔ مذہبی طبقے نے مرد کو برا بھلا نہ کہا کہ بے غیرت آدمی کی مار پیٹ کی وجہ سے اسکا گھر ٹوٹ گیا یہ جو مسلمان عورتوں کے گھر مار پیٹ کے باوجود بس جاتے تھے ان کا کریڈٹ اسلام کو نہیں ہندو خاندانی نظام کو جاتا ہے جس میں عورت پیر کی جوتی کہلاتی تھی۔ اسلام میں خاندان کو ایسے نہیں بچایا جاتا۔ افسوس برصغیر کے دینی طبقے نے ہندو معاشرے کو ہی اسلام سمجھ لیا۔

پاکستان میں احیائے اسلام کی تحریکوں کو صدیوں سے جاری علمائے دین کی غلطیوں کو دہرا کر انکا الزام اپنے سر نہیں لینا چاہئے۔ اسی روش کو دہرانا ہوتا تو ہمیں ایک اسلامی تحریک کی ضرورت ہی کیا تھی۔ ہمیں چاہئے کہ اس معاملے میں بھی اجتماعی نظام کو بدلنے کی جدوجہد کریں اور عورت کو وہ حقوق دلوائیں جو اسلام نے اس کو دیئے ہیں۔ باقی معاملات کی طرح یہاں بھی صحیح کو صحیح اور ظلم کو ظلم کہیں، جاہلانہ نظام کی مذمت کریں۔ یہ کام حکومت میں آئے بغیر بھی ہوسکتا ہے۔

ایسے بلوں کی مخالفت اگرچہ پاکستان میں مغرب کے ایجنڈے کی مخالفت ہے، عورت پر تشدد کی حمایت نہیں، مگر یہ بھی ہے کہ اس سے آج کی مظلوم عورت کی نظر میں اسلام ظالم کے کٹہرے میں کھڑا کر دیا جاتا ہے۔ ظالم کے لئے یہ ہمت افزائی ہے۔

معاشروں کی اخلاقی اقدار میں سب سے اہم رول علماء کا ہے چاہے اسلامی حکومت ہو یا نہ ہو، کسی ظلم کے پیچھے ان کی خاموشی بھی معاشرے کو ظلم کا آفیشل لائسنس جاری کرنے کے مترادف ہوتی ہے

☆.....☆.....☆

سسرال کو ناک آؤٹ کیجئے

سسرال میں عام طور پر بہو ایک مظلوم سی شخصیت تصور کی جاتی ہے اور ساس سسر بالخصوص نندیں ظالم وڈیرے کی طرح.....لیکن آج ہم سسرال کو ناک آؤٹ کرنے کے لئے کچھ ایسے مشورے دینے جا رہے ہیں جن پر عمل کر کے ایک بہو جلد کامیابی کی منازل طے کر سکتی ہے۔ سسرال میں قدم رکھتے ہی ایک بہو کو اگر آرام اور چین کی نیند سونا ہے تو اول دن سے ان باتوں کا خیال رکھنا پڑے گا۔

صبح کو دیر تک سونے کی عادت ہے تو ہرگز 12 بجے سے پہلے کمرہ سے باہر نہ آئے اگر جلدی آنکھ کھل بھی جائے اور ناشتہ کی خواہش ہو تو بہتر ہے کہ کمرہ میں ہی اس کا بندوبست رکھے۔ضروری نہیں کہ گھر کے سب افراد کے ساتھ مل جل کر ناشتہ کیا جائے اور خوامخواہ سلام و آداب کر کے ساس سسر کو سر پہ چڑھایا جائے۔

اب گھر کے کاموں میں بھی زیادہ بڑھ چڑھ کر حصہ لینے کی ضرورت نہیں آخر بہو کے آنے سے پہلے بھی تو گھر کے کام کاج ہو ہی رہے تھے نا۔تو جہاں تک ہو سکے مہمان بن کر ہی گھر میں رہا جائے۔کبھی کبھار ساس اماں کو دکھانے کے لئے شوہر کے آگے پیچھے رہا جا سکتا ہے کہ ان کے بیٹے کا خیال رکھنے والی بہو ان کا اچھا انتخاب ہے۔

گھر سے جب جانا ہو تو گھر والوں سے تذکرہ نہ ہی کیا جائے، کیا خبر کتنی دیر میں آنا ہو اور وہ انتظار ہی کرتے رہیں۔شروع شروع میں شکوہ ہوگا لیکن آہستہ آہستہ وہ اس بے نیازی اور بدتہذیبی کے عادی ہو ہی جائیں گے اور یوں آنے جانے اور آزاد گھومنے پھرنے میں کوئی رکاوٹ نہیں رہے گی۔

سسرال کو اپنا گھر سمجھنے کی غلطی کبھی نہ کی جائے۔خاص طور سے اگر کوئی رشتہ دار مہمان آجائے تو زیادہ خاطر تواضع یا گھل مل کے بیٹھنے کی ہرگز ضرورت نہیں۔اس طرح بار بار آنے کی حوصلہ شکنی کرتی رہیں تو جلد رشتہ داروں سے فاصلے پیدا ہو جائیں گے اور مہمانداری کی زحمت سے بچا جا سکے گا۔

کچن کا معاملہ بھی بہت نازک ہوتا ہے۔اگر یہاں کام میں مہارت دکھائی تو یوں سمجھو تمہارے حوالے ہوا۔بس نادان بنے رہنے میں ہی عافیت ہے بدمزگی ہوگی لیکن تمہارے لیے خوشگواری اسی میں ہے ڈھیٹ بن کر سب کو کام کرتے دیکھو اور خود ہاتھ نہ بڑھاؤ۔

البتہ اپنے چھوٹے دیور اور نند ہو تو ان سے دوستی ضرور رکھنا۔یہ تمہارے لیے ادب لحاظ کرتے ہوئے کبھی تمہارا حکم نہیں ٹالیں گے لہٰذا ان سے اچھی خدمت لے سکتی ہو۔تحفہ تحائف دے کر اور کبھی سیر و تفریح پہ ساتھ لے جا کر انہیں خوش رکھنا، اس میں تمہارا بھلا ہے۔

سسرال میں بیماری تکلیف کے موقعوں پر بھی بہت احتیاط برتنا ہوگی۔مثلاً ساس سسر بیمار ہوں تو ایسا نہ ہو کہ تمہارا دل نرم پڑ جائے ذرا سی خدمت انکو توانائی دے سکتی ہے اور پھر تمہیں ہی بھگتنا پڑے گا۔ البتہ بظاہر ہمدردی کے چند بول بول دینے میں کوئی حرج نہیں دل کو سمجھانا کہ یہ تمہارے ماں باپ تو ہیں نہیں جو تم ان کی تکلیف پہ ہلکان ہوئی جاؤ۔یہ تو ان کی اولاد کا فرض ہے۔آخر کس دن کے لئے پیدا کی تھی ؟ پھر بھی اگر دل نہ مانے تو کوئی بہانہ کر کے میکے چلی جانا۔

ہاں میکے جاتے ہوئے اپنے کمرے کی ہر چیز خوب دیکھ بھال کر بند ضرور کر لینا کہیں کوئی استعمال نہ کر لے۔الماری اور دیگر چیزیں لاک کر کے چابی اپنے ساتھ ہی لیے جانا کہ یہ تمہاری ملکیت ہیں۔تمہیں اپنے حقوق کا خوب پتہ ہونا چاہئے۔

سسرال میں نوکروں کے ساتھ بھی ایک خاص رویہ رکھا جاتا ہے ۔

یہ بڑے کام کے لوگ ہوتے ہیں ۔ چند ٹکوں میں تمہیں بہت ساری معلومات فراہم کر دیں گے ۔ ان کے ذریعے رشتہ داروں کے تعلقات کی نوعیت، خوشی ناراضگی کی وجوہات، اگلی پچھلی شکایتیں سب معلوم کی جا سکتی ہیں ۔ یہ خوب بڑھا چڑھا کر بتائیں گے، لیکن کیا ہرج ہے کوئی سرا تو ہاتھ لگ ہی جائیگا ۔ اس طرح خاندان کے کچھ راز ، کچھ کمزوریاں تمہارے کام آئیں گی ۔

ان ساری احتیاطی تدبیروں کے بعد بھی اپنا مزاج ذرا برہم ہی رکھنا ہوگا ۔ کبھی تمہاری مسکراہٹ یا خوش گفتاری سے کوئی اچھی توقعات لگا لے اور گھر کی فضا میں کوئی خوشگواری گھل جائے ۔

اگر ابتدا میں ضمیر کی خلش پریشان کرے تو خود کو سمجھا لینا کہ اپنا مقام بنانے کے لئے یہ کڑوا گھونٹ تو پینا ہی ہوگا ۔ پھر اتنی عادت ہو جائے گی کہ بالکل نارمل لگنے لگے گا ۔

☆.....☆.....☆

بتول میگزین

یادیں ان کی

سعدیہ شفیق۔گوجرانوالہ

بتول میں کنیز فاطمہ صاحبہ کا تذکرہ ان کی بیٹی کے قلم سے لکھا نظر آیا اور ان کی یادیں پھر سے تازہ ہوگئیں۔

ان سے میرا تعارف میرے بچپن سے تھا کہ جب ہم ساری بہنیں اپنی دادی اماں مرحومہ کے ساتھ رمضان میں صلوۃ التسبیح پڑھنے ان کے گھر جاتیں۔آپا کنیز فاطمہ کا سرخ وسفید چہرہ سفید دوپٹے اور صاف ستھرے لباس میں دمک رہا ہوتا۔خوشی اور پاکیزگی ان کے چہرے سے ایک نور کی صورت پھوٹ رہی ہوتی۔نماز کے بعد سب خواتین سے فرداً فرداً ملتیں۔حال احوال پوچھتیں۔اکثر تراویح کیلئے مقدس مسجد اور رمضان میں جمعہ کی نماز کی ادائیگی کیلئے بلال مسجد میں ان سے ملاقات ہوتی۔تب ہم ان کو ملک محمد رفیق صاحب کی اہلیہ کی حیثیت سے جانتے تھے جو کہ ایک معروف سماجی اور سیاسی شخصیات تھے۔

آپا سے میرا دوبارہ تعارف گوجرانوالہ میں طالبات کی ناظمہ کی حیثیت سے ہوا آپ سے پروگرام کروانا ہوتا یا فنڈ وغیرہ کی وصولی کا مرحلہ ہوتا ان کو میں نے ہمیشہ تیار اور حاضر پایا۔

بعد میں دوبارہ اجتماعی سرگرمیوں سے منسلک ہوئی۔شادی کے ایک طویل عرصہ آپا کو پتہ چلا تو بہت خوش ہوئیں اور مجھے مبارکباد دی۔ میرا گھر ان کے قریب تھا۔میرے بچے چھوٹے تھے تو میری سہولت کا بہت خیال رکھتیں۔اکثر کوئی مشورہ کرنے پیدل چل کر آجاتیں میں کہتی آپا آپ مجھے بلا لیتیں تو کہتیں اسی بہانے میری سیر ہوگئی ہے اور دوسرا تمہارے بچے چھوٹے ہیں اور کام زیادہ ، میں نے سوچا میں خود ہی سعدیہ سے مل آؤں۔

چھوٹے بچوں کے ساتھ کام کرنے کی وجہ سے میں کبھی گھبراہٹ کا شکار ہوتی تو مجھے بہت تسلی دیتیں ۔ بتایا کرتیں کہ میں نے چھوٹے چھوٹے بچوں کے ساتھ آپا جی حمیدہ بیگم سے قرآن پاک کا ترجمہ پڑھا۔ صبح صبح کام نمٹا کر چھوٹے بچے کو ساتھ لیکر ترجمہ پڑھنے جاتی اور واپس آ کر گھر کے کام سمیٹ کر عصر کے بعد جو پڑھا ہوتا اسے دوسروں تک پہنچانے کی تڑپ میں گھر پہ ترجمہ کی کلاس لیتیں ان کا کلاسز لینے کا یہ سلسلہ آخری عمر تک قائم رہا۔گزشتہ چند سالوں سے زیادہ بیمار رہنے لگ گئی تھیں ۔ درس وغیرہ نہ دے سکتیں ۔تھوڑا سا بول کر بھی تھکن محسوس کرنے لگتیں۔کمر اور پاؤں کے درد کی وجہ سے کہیں جانا آنا مشکل ہوگیا تو خواہش ہوتی کہ میرے گھر پر پروگرام رکھ لو۔اپنی بیماری کے باوجود پروگرام میں نہ صرف شریک ہوتیں بلکہ خاطر تواضع کی بھی فکر رہتی کہ کسی پروگرام میں بھی کچھ نہ کچھ کھلائے بغیر نہ آنے دیتیں۔اپنے ہاتھ سے پکا کر کھلانے کا بہت شوق ہوتا تھا۔اکثر پارٹیز وغیرہ میں فروٹ چاٹ بنا کر کھلاتیں جو کہ بہت مزے کی ہوتی۔جس میں آپا جی کی محنت کے ساتھ محبت بھی شامل ہوتی۔اب ثمینہ بھابھی کا بھی یہی معمول ہے۔

گزشتہ 4 سال سے دورہ قرآن خود نہ لے سکتی تھیں تو رمضان سے قبل ہی مجھے بلا کر دورہ قرآن اپنے گھر لینے کی تاکید کرتیں میں دورہ قرآن لینے جاتی تو بہت محبت سے استقبال کرتیں۔اور بار بار اس بات کا اظہار کرتیں کہ مجھے تو یہ فکر تھی کہ میں نے ساری زندگی دورہ قرآن نہیں چھوڑا تو اب اگر میں نہ لے سکی تو کیا میرے گھر دورہ قرآن نہیں ہوگا۔ بہت شکریہ ادا کرتیں۔ مجھے دعائیں دیتیں اور کہتیں جمعیت کا یہ احسان ہے کہ اس نے تربیت یافتہ افراد ہمیں دیئے۔میرے شوہر شفیق صاحب اور بچوں کے لئے دعائیں کرتیں کہ ان کے تعاون کی وجہ سے ممکن ہوا کہ

میں ان کے ہاں دورۂ قرآن لے سکی۔

اپنی بیماری میں اپنے بچوں خصوصاً ظہیر بھائی اور بہو ثمینہ بھابھی کی خدمت اور توجہ کا بہت ذکر کرتیں۔ ویسے تو سارے بچوں کے لئے ہی دعائیں کرتیں لیکن ظہیر بھائی اور ثمینہ بھابھی سے خصوصی لگاؤ تھا۔

اکثر فرمایا کرتیں کہ میں نے دین کے لئے اپنے آپ کو اور اپنے گھر بار کو وقف کئے رکھا اس کا اجر اللہ نے مجھے فرمانبردار اولاد کی صورت میں دیا۔ ہمیشہ خوش رہتیں اور شکر کرتی رہتیں۔ بیماری میں جب چلنا پھرنا بھی مشکل ہو گیا تو بھی الحمدللہ ہی کہتیں۔

آخری عمر میں اکثر کہتیں کہ ہم تو چراغِ سحری ہیں کسی وقت بھی بجھ جائیں گے۔ بس میرا دل یہ چاہتا ہے کہ میرے بعد میرے بچے اور میرا گھر دین کے لئے وقف رہے اور لوگ یہاں سے دین سیکھ کر جائیں اور میرے بچے میرے لیے صدقہ جاریہ بنیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی قبر کو نور سے بھر دے۔ ان کی حسنات کو قبول فرمائے اور کوتاہیوں سے درگزر فرمائے۔ آمین

☆.....☆.....☆

کیسی سرداری!

ذکیہ فرحت۔ کراچی

دیکھے تو ہے دنیا ساری بول نہ پائے پر بیچاری
دیکھو کیسے قدم قدم پر چھب دکھلائے گوری ناری

گم ہے دانش، گنگ زباں ہے ہمت سے ہے سینہ خالی
آزادی کا نعرہ کیا دیں دل پر بھی ہے ہیبت طاری

سازش انکی کیا سمجھیں گے دشمن کو جو دوست بنائیں
خود کو بھی وہ بیچ چکے ہیں عقل کی بھی ہو گئی نجکاری

کہنے کو تو دانشمند ہیں، کیسۂ سر ہے عقل سے خالی
گم ہے بصیرت اور بصارت دل بھی جذبوں سے ہے عاری

دشمن کی خوشنودی میں وہ دن دیکھیں نہ رات کو دیکھیں
چلتے ہیں دشمن کے پیچھے ان کے پیچھے دنیا ساری

دوست کو اپنے پیچھے چھوڑیں دشمن سے وہ ہاتھ ملائیں
نفرت ہے جمہور کو ان سے، دشمن جائے ان پر واری

کر کے سودا آزادی کا دانش کا جھنڈا لہرائیں
اپنی بھی اوقات گنوائیں کیسی ہے ان کی سرداری

☆.....☆.....☆

انسان کی حقیقت

شہزادی ام صائم۔ لاہور

آج سے دس سال پہلے جب میرے والد صاحب کی طبیعت کافی خراب رہنے لگی تو باجی انہیں اپنے گھر ماڈل ٹاؤن لے آئیں کہ یہاں سے ہسپتال وغیرہ قریب ہیں کیونکہ وہ دمہ اور شوگر کے مریض تھے اور اچانک ان کی طبیعت بگڑ گئی جاتی تو وہ انہیں فوراً ہسپتال یا ڈاکٹر کے پاس لے جاتیں۔

میرا گھر اوپر والی منزل پر تھا اور والد صاحب سیڑھیاں نہیں چڑھ پاتے تھے۔ اس لئے بھی باجی کی طرف رہ لیتے باجی کی بہو حمل سے تھی اور باجی کو اس کے پاس کراچی جانا تھا تو کچھ دنوں کے لئے میں باجی کی طرف چلی گئی۔

شوگر کی وجہ سے والد صاحب کے پاؤں سن بھی رہتے اور سوجن بھی رہتی تو میں روز ان کے پاؤں کی گرم پانی سے ٹکور کر کے سرسوں کے تیل کی مالش کرتی تو انہیں بہت سکون ملتا۔ والد صاحب بہت دعائیں دیتے اور اکثر یہ کہتے کہ انسان پتہ نہیں کیوں بیٹے مانگتا ہے جب کہ کام تو بیٹیاں آتی ہیں (ہمارے بھائی نے کبھی آ کر ان کا حال بھی دریافت نہیں کیا تھا۔) ایک دن میں والد صاحب کے پاؤں کی مالش کرنے لگی تو دیکھا ان کا ٹخنہ بالکل کالا ہو رہا ہے حالانکہ کل تک تو بالکل ٹھیک تھا۔ جب میں نے قریب سے دیکھا تو وہ کسی اور وجہ سے کالا نہیں ہوا تھا بلکہ چھوٹی والی باریک چیونٹیوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ میں تو پوری جان سے کانپ کر رہ

گئی کہ ایک چیونٹی ہمیں کاٹ لے یا ہم پر چڑھے تو فوراً وہیں پر اس کو مسل دیتے ہیں لیکن کہاں اتنی چیونٹیاں۔

جب والد صاحب کی نظر ان چیونٹیوں پر گئی تو ان کے احساسات کچھ یہ تھے انہوں نے مجھے کہا'' دیکھو بیٹا یہ ہے انسان کی اوقات کتنا بے بس اور بے وقعت ہو جاتا ہے۔ابھی تو میں زندہ ہوں اور مجھے چیونٹیاں کھا رہی ہیں تو قبر میں انسان کے ساتھ کیا معاملہ ہوگا۔'' اور مرتے دم تک وہ اکثر اس بات کو یاد کرتے رہے اور میرے ساتھ ضرور اس کا ذکر کرتے۔اب تو میں نے اس دعا کو حرز جاں بنا لیا ہے کہ یا اللہ ہمیں اور ہمارے فوت شدگان کو قبر کے عذاب سے محفوظ رکھنا، ہماری خطائیں معاف فرما دینا۔آمین

☆.....☆.....☆

نئے انداز کی گداگری

مزنہ سید۔کراچی

پرس میں کچھ پیسے رکھ کر گھر سے یہ سوچ کر نکلی تھی کہ آج ان پیسوں سے یونیورسٹی کے باہر کھڑے میلے سفید کپڑوں میں ملبوس سانولے رنگ کے بچے سے جو ٹشو پیپر کے چھوٹے پیکٹ بیچتا ہے، کچھ ٹشو پیپر خریدوں گی، اس کی مدد بھی ہو جائے گی اور خریداری بھی۔

گھر سے لے کر یونیورسٹی تک کے سفر کے دوران بہت سے فقیر آئے۔آخر میں ان سے بچتے بچاتے چنگ چی پکڑی کہ اب تو یونیورسٹی بہت تھوڑے فاصلے پر ہے۔بس چنگ چی والے کو چنگ چی بھرنے کا انتظار تھا۔ابھی بیٹھی ہی تھی کہ ایک ہٹی کٹی سی فقیرنی آء اور آتے ہی دعائیں دینا شروع کر دیں۔

''اے بیٹا اللہ کے نام پر دے دے تیری شادی ہو تجھے چاند سا دولہا ملے۔''

نہ جانے اسے مجھ میں ایسا کیا نظر آیا جو میری ساتھ بیٹھی دیگر دو لڑکیوں کو چھوڑ کر وہ میرے پیچھے لگ گئی حتیٰ کے اس نے میری ٹانگیں پکڑ لیں۔شاید یہ پرس میں رکھے ان پیسوں کی کرامت تھی جو میں نے کسی غریب حقدار کی مدد کی نیت سے رکھے تھے۔

تھوڑی دیر تک دعاؤں سے کام چلانے کے بعد جب اسے لگا کہ سیدھی انگلیوں سے گھی نہیں نکلے گا تو اس نے مجھے بد دعائیں دینا شروع کر دیں وہ بھی ایسی ایسی کہ اللہ معاف کرے۔چنگ چی والے کی چنگ چی تو نہ جانے کب تھرتی مگر یہ مسلسل بد دعائیں ضرور مجھے گھبراہٹ میں مبتلا کر رہی تھیں۔میں نے ہڑا کر وہ پیسے اسے دے ہی دیئے، یا یہ کہہ لیں کہ وہ میرے پاس سے ٹس سے مس نہ ہوئی جب تک اس نے وہ پیسے نکلوا نہ لیے۔میری مدد کرنے کی خواہش تو حسرت ہی بن گئی مگر میرے ان پیسوں پر لگی اس کی نظر ضرور پوری ہوگئی۔

اس واقعے نے مجھے یہ ضرور سکھا دیا کہ پیشہ ور گداگری کی تقویت ہم دے رہے ہیں، بغیر محنت مشقت کیسے کمانے کی عادت بھی ہم ڈال رہے ہیں۔اب تو یہ ذی شعور پڑھے لکھے لوگوں کی ذات کا بھی حصہ بنتی جا رہی ہے جو کسی انعامی اسکیم اور پروگرامز چاہئے وہ مورننگ شو کی صورت میں ہوں یا رات کے مفت کا مال بانٹنے والے پروگرام لاکھوں کے پلاٹ، زیورات، کار اور بائیک بغیر کسی ذہنی اور جسمانی مشقت کے چند لمحوں میں سب کچھ جتوا دے، جسے اگر حقیقت میں حاصل کرنے کی کوشش کی جائے تو عرصے کی محنت کے بعد حاصل ہو۔مگر بھلا ہو ان پروگراموں کا جنہوں نے ہمارے پڑھے لکھے طبقے کو بھی مانگنا سکھا دیا، بس طریقہ ذرا مختلف ہے تو کیا ہوا، وہ تو ہر دور میں مختلف ہی ہوتا ہے۔یونیورسٹی کے قریب وہ عورت میرے پیچھے لگی تھی تو یہاں صبح اور رات کے پروگراموں میں شرکا پیچھے لگ جاتے ہیں۔کبھی کبھی تو وہ لوگ مانگتے ہوئے نظر آتے ہیں جن کے گھروں میں پہلے ہی مال کی کوئی کمی نہیں ہوتی۔خرچ تو ہم بہت کرتے ہیں مگر پھر بھی ہمیں یہ آج تک پتہ نہیں چلا کہ ہم خرچ کہاں کرتے ہیں۔دس دس ہزار کے لان کے پرنٹوں پر، انعامی اسکیموں پر، آرائش و زیبائش پر، مگر ایک بات تو طے ہے، اب ہمیں یہ معلوم ہو جانا چاہیے کہ سیلف ریسپکٹ ہوتی کیا ہے، چاہے وہ سڑک پر بیٹھے گداگر ہوں یا پروگراموں میں مانگنے والے شرکا۔عزت سے کمائیں، صبر کا دامن تھام لیں اور مانگنے سے اجتناب کریں تو یہ زیادہ باوقار رویہ ہے۔☆

محشرِ خیال

حبیب الرحمٰن۔لاہور

بتول اکثر کافی لیٹ ملا کرتا تھا جس کی وجہ سے بہت ساری باتیں جو قابل تبصرہ ہوتیں وہ ضبطِ تحریر ہونے سے رہ جاتیں لیکن گزشتہ دو ماہ سے بتول وقت سے ملنے لگا ہے اور مضامین پڑھ لینے کے بعد کسی کسی پر قلم اٹھانے پر طبیعت بھی مائل ہوتی ہے لیکن جب کچھ وقت گزر جائے تو باقی مہینہ از خود بہت تیزی کے ساتھ گزر جاتا ہے اور اس طرح قلم اٹھا کا اٹھا ہی رہ جاتا ہے اس لئے میں نے سوچا ہے کہ اس مرتبہ اپنے خیالات کا اظہار ضرور کروں۔

سب سے پہلے تو میں یہ ضروری سمجھتا ہوں کہ آپ کا شکریہ ادا کروں کہ آپ اپنے رسالہ میں قریب قریب ایک سال سے مسلسل میری حوصلہ افزائی کر رہی ہیں، اللہ کرے آپ اپنے لکھنے والوں کے لئے اسی طرح وقت نکالتی رہیں اور اس رسالے کی خدمت کرتی رہیں (آمین)۔

دسمبر 2015ء میں شائع ہونے والے رسالے میں ''ام ایمان'' کا افسانہ ''ڈائن'' ماشااللہ بہت اچھا تھا اور سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ انہوں نے افسانے کے عنوان کے ساتھ بہت ہی انصاف کیا۔ کاش لوگ سمجھ سکے ہوں کہ ''ڈائن'' آخر تھی کون۔

فروری 2016ء میں شائع ہونے والی ''نجمہ یاسمین یوسف'' کی نظم ''عجب یہ خوش گمانی ہے'' بہت ہی معیاری اور دل میں اتر جانے والی تھی جس میں چھوٹی چھوٹی سطروں میں ہلکے پھلکے الفاظ کا سہارا لیکر بہت بڑی بات نہایت ہنرمندی کے ساتھ بیان کی گئی۔ اللہ ان کے قلم کو اور بھی زیادہ زور آور بنائے (آمین) ویسے وہ غزلیں بھی بہت اچھی کہتی ہیں اور معاشرے کی بہت ساری کمزوریوں کو بہت خوبصورتی کے ساتھ بیان کر دیتی ہیں جیسے اس شعر میں وہ ایک بات کہہ کر آگے بڑھ گئیں۔

وہ کیسے لاڈلی کا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دے
گو آدمی وہ بھلا ہے مگر غریب سا ہے

دسمبر 2015ء کو جواداریہ آپ نے لکھا اچھا لگا، بے شک اگر ہم ایک دوسرے کے گلے کاٹنے سے باز آجائیں اور اپنی توانائیاں مثبت اور موثر کاموں میں صرف کریں تو بہت ساری مشکلات سے بچا جا سکتا ہے جس کا امکان کم ہی نظر آرہا ہے، سچی بات یہ ہے کہ جب تک ہم اپنے اپنے مفادات سے باہر نہیں نکلیں گے ہمارے لئے مشکلات سے باہر آنا بہت ہی مشکل ہو جائے گا۔

☆.....☆.....☆

تحریم اعجاز۔لاہور

امید ہے آپ خیریت سے ہونگی حسب معمول مہینے کے شروع میں ہی بتول موصول ہو گیا اور جلدی جلدی پڑھ ڈالا۔ سب مضمون اور افسانے بہت اچھے تھے۔ فرحی نعیم کا افسانہ ''داستان دل'' پسند آیا اور حمیرا بنت فرید کا ''کارساز'' بھی۔ خاص مضمون ''خواتین کے حلقۂ ہائے درسِ قرآن'' بہت اہم موضوع پر تھا۔ ڈاکٹر آسیہ شبیر نے بہت محنت اور تحقیق سے یہ مضمون لکھا ہے اور انہوں نے بہت سے اہم موضوعات پر روشنی ڈالی ہے جس کی مدرسات کو دیکھنے کی ضرورت ہے۔

☆.....☆.....☆

سیدہ فاطمہ گیلانی۔ساہیوال

شمارہ کیا ہے ماشاءاللہ ہمیشہ کی طرح شاندار، مخلصین کی دردِ دل سے نکلی تحریریں اسے ایک صحیفے جیسا مفید اور مقدس بنا دیتی ہیں۔ محشرِ خیال میں جگہ پانا ایک اعزاز سے کم نہیں میری ایک دوست اپنے والد محترم کے حوالے سے کہتی ہیں کہ کچھ لوگ خود بادشاہ نہیں ہوتے لیکن

بادشاہ گر ہوتے ہیں یہ خدا تعالیٰ کی دین ہے اور پھر مسلمانوں کا ایک دوسرے کو اکرام دینا اللہ کریم کو بھی بہت پسند اور مطلوب ہے کیونکہ اسی سے خوبیاں پروان چڑھتی اور بھلائیاں پھلتی پھولتی ہیں۔

''روزگار کی تلاش میں''، بشریٰ تسنیم نے ایک اعلیٰ نکتے کو سنہرے الفاظ میں رقم کر دیا ہے۔ ''غارِ حرا کی تنہائی کا سکون ہو یا سدرۃ المنتہیٰ کی رونقیں داعی اپنے میدان عمل سے غافل نہیں ہوتا۔ دونوں مقام داعی کے لئے راستہ ہیں منزل نہیں''

اس دفعہ مرد و عورت کے حقوق والی تحریریں غالب ہیں۔ نصرت یوسف نے قوم کے ایک نمایاں عیب کا تذکرہ کیا ہے نبی کریمؐ نے سستی اور کاہلی سے بھی بڑے گناہوں ہی کی طرح پناہ مانگی ہے۔ جنگ تبوک میں پیچھے رہ جانے والے تین مخلص صحابہ کرامؓ کو اس سستی کی جو سزا ملی کہ ان پر زمین تنگ ہوگئی۔ ہم اس بات کو عیب ہی نہیں بلکہ خوبی سمجھتے ہیں۔ بڑے فخر سے اپنی گاڑی اور بنگلہ چمکا کر سڑک پر کیچڑ پھیلا دیتے ہیں۔ سڑک پر پانی کو خشک کرنے میں ہماری کاہلی آڑے آجاتی ہے جس کے نتیجے میں سالوں بعد لاکھوں روپے سے بننے والی قوم کی سڑک جو ہمارے ہی کام آتی ہے ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو کر ہماری پسلیاں اور ہماری گاڑیاں توڑنے لگتی ہے۔ اس بات پر زبردست جرمانہ ہونا چاہئے۔ خوشی غمی کے موقعوں پر راستے بند کرنا اور اپنے گھر کی صفائی کر کے باہر کا ماحول گندہ کرنا پست ذہنیت کی علامت ہے۔

فریدہ خالد نے سرونٹ لیڈر شپ تحریر کر کے زندگی کا فن نہ صرف اجاگر کیا ہے بلکہ عمل کے لئے عصر حاضر کے دانشوروں کے حوالے دے کر عام لوگوں کے لئے بھی اس تحریر کو خاص کر دیا ہے۔ خواتین کے کردار کا بھی اعتراف کیا گیا۔ ہر معاشرے میں خواتین ہمیشہ سرونٹ لیڈر کا کردار نبھاتی آئی ہیں۔ سارے پیغمبر ہی دراصل سرونٹ لیڈر تھے لیکن ہمارے نبیؐ تو اس مثال کی معراج پر تھے مسلم غیر مسلم سب اس بات کے قائل ہیں۔ میرا بیٹا جو امریکہ کے ایک ادارے میں الیکٹرکل انجینئرنگ کی تعلیم لے رہا ہے بتا رہا تھا کہ ان لوگوں کی ٹیبل پر سیرت کی کتب پڑی ہیں، ان کے کمروں میں انگلش ترجمہ قرآن موجود ہیں سیرت کی کتاب میں پیارے نبیؐ کی خصوصیات پر انہوں نے لائنیں لگا رکھی ہیں اسی لئے تو کامیاب ہیں نبیؐ کی بیٹی کی طرح سارے کام خود کرتے ہیں، نبیؐ کی طرح خود کسی کام کو کرنے میں عار نہیں سمجھتے چاہے چیف جسٹس کیوں نہ ہوں۔ صرف عریانی بے حیائی نے ان کا بیڑہ غرق کر رکھا ہے۔ ورنہ باقی تقریباً سارے اصول الہامی کتب سے لے کر مستفید ہو رہے ہیں۔ اللہ کرے ہماری جہالت بھی دور ہو جائے۔ انہی اچھے اصولوں پر عمل کر کے اونٹ چرانے والے امیر المومنین اور آدھی دنیا کے مالک بن گئے۔

ہلکا پھلکا میں ''ہم دعا لکھتے رہے.....'' میاں بیوی کی زندگی کی عکاسی ہے، بشریٰ تسنیم کا یہ مزاح سے بھرپور رخ ہم سے اب تک پوشیدہ رہا۔

☆.....☆.....☆

سعدیہ فرح۔ لاہور

بچپن ہی سے بتول گھر میں آتا اور پڑھا جاتا رہا ہے مگر ایک دو سے زیادہ تحریریں کبھی نہیں پڑھتی تھی، لیکن مارچ ۲۰۱۶ کا بتول پڑھ کر جو مزہ اس بار آیا ہے وہ آج تک کسی رسالے کو پورا پڑھ کر نہیں آیا۔ آخری صفحے تک پہنچتے پہنچتے دل اداس ہوگیا تھا کہ اتنی جلدی آخری صفحہ بھی آ گیا۔

افشاں نوید کی بہت حوصلہ افزائی اور رہنمائی سے بھرپور تحریر نے آخر کار مجھ بدذوق کو بھی قلم اٹھانے پر مجبور کر دیا۔ واقعی اگر ہم اپنا یہ ہتھیار اب نہیں اٹھائیں گے تو کب اٹھائیں گے، اور خرابی پر صرف دل ہی دل میں کڑھتے ہی رہیں گے؟ اور ان کا یہ انمول مشورہ میرے تو بہت ہی کام آیا کہ لکھنے کے لئے خود بھی پڑھنا بہت ضروری ہے۔ جتنا اچھی تحریروں کو پڑھ کر اپنے آپ کو لکھنے پر اکسایا جا سکتا ہے، محض الیکٹرانک اور سوشل میڈیا کے ذریعے دیکھ کر نہیں۔

صائمہ اسماء صاحبہ نے تو بیٹھے بٹھائے اچھی خاصی سیر کروا دی، کہ پڑھنے کے بعد میں نے سوچا یہ ٹانگوں میں درد کیسا ہونے لگا؟

لکھنے کا شوق بہت ہے لیکن معلوم نہیں ہے کہ شروع کیسے کروں، اس لئے آپ کے اس محشرِ خیال میں حاضری دی ہے کہ پانی کی

گہرائی کا اندازہ کرسکوں اور پھر مزید اس علم و آگہی کے سمندر میں غوطہ زن ہونے کی تیاری کرسکوں۔

بس اتنا جانتی ہوں کہ یہ تحریر پڑھ کر دنیا میں کوئی خوش ہو یا نہ ہو میری والدہ بہت خوش ہونگی، کیونکہ اور والدین کی طرح انکی بھی ہمیشہ سے یہ خواہش رہی ہے کہ ہر اولاد ان کے نقشِ قدم پر چلے اور دیر آید درست آید کے مصداق اپنی بہن اور بھائی کے بعد آج میں نے بھی اس راہ کی پہلی سیڑھی پر قدم رکھ دیا ہے۔ان کی حوصلہ افزائی کے بغیر میں یہ چند الفاظ بھی نہ لکھ پاتی۔اللہ سب کو ان جیسی مائیں دے، جو دنیا اور آخرت دونوں کی کامیابی کی تیاری میں مدد دیتی ہیں اور گرنے نہیں دیتیں۔

بتول کی مدیرہ سے گزارش ہے کہ ایک موقع ضرور دیجئے گا میں مستقل لکھاری بننا چاہتی ہوں، ایسے موقع پر اگر ہاتھ تھام لیں تو ساری منزلیں آسان ہوجاتی ہیں اور آگے کے مناظر واضح ہوجاتے ہیں۔آپ کا شکریہ۔

☆.....☆.....☆

ہماری جنت کے معمار

ہم سڑک پہ، راستے میں، اپنے گھر کے اردگرد، شہر میں کہیں نہ کہیں کوئی گھر تعمیر ہوتا دیکھتے ہیں۔ اس گھر کو تعمیر کرنے والے معمار، مزدور اور دیگر ذمہ داریاں نبھانے والے لوگ کسی کے گھر کی تعمیر کے لئے محنت کر رہے ہوتے ہیں۔ سب مزدور کسی کے گھر کو بنانے کے لئے مشقت کر رہے ہیں، انہوں نے اس گھر میں نہیں رہنا۔

بالکل اسی طرح اس دنیا میں بہت سے مزدور، معمار ایسے ہیں جو کسی کے ''اخروی گھر'' کی تعمیر میں مصروف رہتے ہیں اور طرفہ تماشا یہ ہے کہ وہ کسی ''اپنے'' کے نہیں غیر کے گھر کو بنانے میں مصروف ہوتے ہیں۔ غیر ان معنوں میں کہ وہ اپنے مخالف، حریف، رقیب، مدمقابل کا گھر بنا رہے ہیں۔ دنیا کا گھر بنانے والے مزدور تو محنت کی اجرت کمائی سے کر لیتے ہیں۔ مگر کسی کا اخروی گھر تعمیر کرنے والے مزدور اپنی کمائی سے خرچ کر کے یہ خدمت انجام دے رہے ہوتے ہیں اور ان نادانوں کو یہ خبر ہی نہیں کہ وہ اپنا ''مال'' کس پر خرچ کر رہے ہیں، وہ اس زعم میں مبتلا ہوتے ہیں کہ اپنے دشمن سے حریف سے انتقام لے رہے ہیں، دل کی بھڑاس نکال رہے ہیں۔

ہوسکتا ہے یہ ''کار خیر'' انجام دینے والے مزدور اور معمار آپ کے حصے میں بھی آئے ہوئے ہوں۔

دنیا میں اس طرح کے معتوب مگر خوش قسمت لوگ وہ ہیں جن کو علم نہیں ہے کہ کوئی ان کے لئے جنت جیسی عظیم الشان جگہ پہ اپنے ''ہاتھ کی کمائی'' خرچ کر کے گھر تعمیر کر رہا ہے۔ ہوسکتا ہے ان خوش قسمت لوگوں کو ''فیصلے کے دن'' سرپرائز ملے کہ ''آج یہ خوب صورت محل آپ کے لئے، آپ کے بدخواہوں نے تیار کیا ہے۔'' ہوسکتا ہے وہ غیر متوقع انعام حاصل کرنے والے آپ ہی ہوں۔

آپ کی غیبت، چغلی کرنے والے، آپ کے حاسد، آپ کو نیچا دکھانے والے، اور نتیجتاً بلاوجہ نفرت کرنے والے، دوستی کی آڑ میں دشمنی کرنے والے، دراصل آپ کے ''خیرخواہ'' ہیں۔ یہ وہ مزدور اور معمار ہیں جو اپنا وقت، صلاحیتیں اور بعض اوقات رقم خرچ کر کے آپ کے لئے وہ کچھ جمع کر رہے ہیں جو آپ اپنی عبادتوں سے بھی شاید حاصل نہ کر سکتے ہوں۔ آپ کی نیکیوں میں جو کمی اور جھول رہ جاتا ہے، ان کی کمی کو پورا کرنے کے لئے بھی یہی لوگ کام کرتے ہیں۔

غیبت، بدگمانی، جھوٹ، حسد یہ وہ ''اوزار'' ہیں جن سے وہ آپ کے گھر تعمیر کرتے ہیں۔ اپنی نیکیوں کی دولت کو بے دریغ آپ کے لئے خرچ کرتے ہیں۔ آپ کے جملوں اور لفظوں کو سیاق وسباق سے ہٹ کر غلط معنی پہنانے کے بعد اس کی تشہیر کرنے والے۔ آپ کو رسوا کرنے کی کوشش کرنے والے اپنی نیکیوں کی دولت بے دریغ آپ پر خرچ کر رہے ہوتے ہیں۔

اپنے ان ''خیرخواہوں'' کی قدر کرنا آپ کا فرض ہے اور ان سے حسن سلوک ہی آپ کے اخلاق کریمانہ کو زیب دیتا ہے۔ ان سے حسن سلوک یہ ہے کہ:

1۔ آپ ان کے ہاتھوں اپنے لئے تعمیر کردہ جنت کو برباد نہ کریں۔ آخر کون سا احمق ہوگا جو مفت میں ملنے والے گھر کو انہی ''اوزاروں'' سے توڑ پھوڑ کر رکھ دے، جن اوزاروں سے گھر تعمیر کیا گیا ہے۔ اگر آپ نے ان کی ''خاطر تواضع'' کے لئے زبان اور ہاتھ سے اسی ''حسن لوک'' کا اعادہ کیا تو وہ جنت میں ملنے والا گھر تو ہاتھ سے جائے گا ہی بلکہ خطرہ ہے کہ اس ''ناقدری'' کی سزا اپنے اعمال کی پراپرٹی میں سے کچھ دے کر بھگتنی پڑے۔ اس لئے ہوشیار رہیں، اپنے اخروی گھر کی

تعمیر کرنے والوں کے ساتھ حسن سلوک روا رکھیں۔اسی سے دنیا و آخرت کی کامیابی نصیب ہوگی۔کامیاب وہی ہے جس کی دنیا کے ساتھ آخرت بھی محفوظ ہو۔احسان کا بدلہ احسان ہی تو ہے۔

اگر آپ کے قریب رہنے والے دل سے دور ہیں، بلاوجہ عناد اور نفرت چھپائے نہیں چھپا سکتے، ان کی نگاہیں آپ کو دیکھتی ہیں، دل آپ کے عیب تلاش کرتے ہیں۔اچھائی دیکھتے ہیں تو چھپا جاتے ہیں۔آپ ان سے بھلائی کریں تو نسیاً نسیا کر دیتے ہیں، آپکی بشری کمزوریوں اور خطاؤں پر ملمع سازی کر کے تشہیر کرتے ہیں، آپ سے دوستی کی آڑ میں دشمنی نبھاتے ہیں۔

2۔ان سے قرآنی حسن سلوک یہ ہے کہ ان کی ''محنت و مشقت'' کو بدگمانی کی نگاہ سے نہ دیکھیں۔اپنی جنت کی تعمیر کرنے والوں کی قدردانی کریں ان کی بھلائی چاہیں۔وہ بھلائی یا حسن سلوک یہ ہے کہ ان کے ہاتھوں اپنی جنت تعمیر کرنے کا طریقہ کار بدلنے کی کوشش کریں۔کوئی ایسا احسن طریقہ کہ وہ گھر تعمیر کرنے کے ''اوزار بدل لیں۔غصہ، انتقام، عناد، غیبت، نفرت، بدگمانی، حسد جیسے اوزاروں کو تبدیل کرنے کا کوئی احسن طریقہ اختیار کریں۔تاکہ ایسے مزدور آپ کے لئے صدقہ جاریہ کا ذریعہ بن جائیں۔یہ کام مشکل ہے۔کیونکہ ایک مزدور جس اوزار کو استعمال کرنے کا عادی ہو جائے اسے نئے اوزار کو استعمال کرنا بہت مشکل لگے گا۔مگر جنت کا اعلیٰ مقام حاصل کرنے کا یہی طریقہ زیادہ کامیاب ہے اور ہمیشہ رہے گا مزدور اور معمار تو وہی رہیں گے مگر تعمیر زیادہ جدید اور خوبصورت اور مضبوط ہو جائے گی اور باہمی تعلق میں محبت اور خلوص ہوگا تو ایک دوسرے کی جنت تعمیر کرنے میں لطف بھی آئے گا۔حقیقت یہی ہے کہ مومن ایک دوسرے کے معاون اور رفیق ہیں۔دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی اور سب سے زیادہ کامیاب وہ ہے جو حلم و بردباری، تحمل اور خاموشی کے ذریعہ سے اپنی دنیا اور آخرت محفوظ کر لے۔

اگر آپ نے اپنا گھر محفوظ کرنے کا پکا ارادہ کر لیا ہے تو اس عمل، بردباری اور خاموشی کو کوئی ''پراسرار سازش'' بھی سمجھا جائے گا۔یہ بھی سننے کو ملے گا کہ ''ایسے لوگ کبھی نہ کبھی خطرناک ثابت ہوتے ہیں۔''

جب آپ کو ایک خوبصورت سی جنت اس پراسرار خاموشی کے بدلے میں حاصل ہوگی تو آپ ان کے لئے ''خطرناک'' ہی ثابت ہو رہے ہوں گے۔کسی کی دولتِ اعمال صالحہ آسانی سے حاصل ہو جائے تو یہ فریق ثانی کے لئے خسارہ اور تہی دامن فقیر ہو جانا ہی تو ہے۔اس سے زیادہ خطرناک بات اور کیا ہوگی؟

تنہائی میں دو نفل ادا کر کے آج یہ حقیقت سامنے لانے کی کوشش کریں کہ آپ کس کس کی جنت تعمیر کرنے کی مشقت میں مبتلا ہیں اور کون اپنی ''پراسرار خاموشی'' سے آپ کے لئے کبھی نہ کبھی ''خطرناک'' ثابت ہو سکتا ہے؟

☆.....☆.....☆